بلند اقبال:

جولوگ مغربی ممالک میں اردو زبان وادب کی سمت ورفتار پر نظر رکھتے ہیں،اور خاص طور پر اردو فکشن کے نشیب وفراز کی کہانی کو سمجھتے ہیں، ان کے لیے بلند اقبال کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ عمر کی جس منزل میں ابھی بلند اقبال ہیں، ادب کے میدان میں نسبتاً جواں سال ادیب کہے جائیں گے، لیکن ان کی تحریروں کی پختگی، موضوعات کی رنگارنگی اور انھیں پیش کرنے کے راست اور نرالے انداز کو دیکھ کر کوئی شخص بہ آسانی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ بلند اقبال جواں سال ادیبوں کے زمرے میں آئیں گے۔

بلند اقبال کی شخصیت کسی ایک دائرے کی اسیر نہیں ہے، بلکہ وہ مختلف الجہات حیثیت کی حامل ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، مثال کے طور پر اگر پیشہ ورانہ حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ میڈیسن کے ڈاکٹر ہیں، یعنی سیدھے سادے لفظوں میں طبیب ہیں۔ طبابت ان کا پیشہ ہے،اور وہ جسمانی مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ادب کے زاویے سے ان کی شخصیت کے اندرون میں ایک افسانہ نگار، ایک فکشن نگار بیٹھا ہوا ہے۔ ٹی وی پروگراموں کی اینکرنگ سے ان کی شخصیت کا مزید ایک پہلو روشن اور تابناک ہوتا ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے پاس دنیا کے مختلف تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کی ڈگریاں موجود ہیں۔ بلند اقبال نے میڈیسن میں ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی سے گریجویشن کیا۔ پوسٹ گریجویشن کی ڈگری نیویارک میڈیکل کالج، امریکا سے حاصل کی، انھیں اریگن ہیلتھ سائنسز یونیورسٹی، امریکا سے فیلوشپ بھی ملی۔ فی الحال بلند اقبال کینیڈا میں میڈیکل اسپیشلسٹ کے طور پر مختلف اسپتالوں سے منسلک ہیں۔

بلند اقبال کی شخصیت کے تعارف کے طور پر ہمارے سامنے ایک مختصر سا مضمون ہے، جسے خود بلند اقبال نے 'میری کہانی' کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ یہاں اسی مضمون کی روشنی میں ان کے مختصر حالات وتعارف تحریر کیے جاتے ہیں۔

بلند اقبال 7 اپریل سنہ 1966ء کو حیدر آباد، سندھ کے ایک ایسے گھرانے میں تولد ہوئے جو علمی اور فکری اعتبار سے متمول و مالدار نیز معاشی طور سے متوسط حیثیت کا حامل تھا۔ بلند اقبال کے والد حمایت علی شاعر اردو دنیا کی ایک اہم ترقی پسند شخصیت رہے ہیں۔ ان کی والدہ معراج نسیم افسانہ نگاری سے خاصا شغف رکھتی تھیں۔ اس ادبی وشعری ماحول نے غیر شعوری طور پر بچپن سے ہی بلند اقبال کو ادب کی راہ کا مسافر بنا دیا۔ چنانچہ کم عمری میں ہی ان کا رشتہ اردو کے بڑے فکشن نگاروں سے استوار ہو گیا۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران انھوں نے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، غلام عباس اور ممتاز مفتی جیسے بڑے افسانہ نگاروں کو پڑھ لیا تھا۔ اسی دوران ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کی تحریروں کے تراجم اور فرائڈ کے نفسیاتی تجزیے بھی لاشعوری طور سے ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے رہے۔

بلند اقبال کے والد حمایت علی شاعر کی وجہ سے گھر میں ادبی اور معیاری رسائل و جرائد آتے رہتے تھے، اور اس طرح سے ان کا ذہنی رشتہ اس دور کے بڑے صحافیوں اور اہل قلم سے خود بخود استوار ہوتا گیا۔ جن اہل قلم کو اس دور میں انھوں نے قریب سے دیکھا اور جانا ان میں احمد ندیم قاسمی، منشا یاد، رشید امجد، سلطان جمیل نسیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بلند اقبال نے اپنے دورِ طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری کی ابتدا کر دی تھی۔ چنانچہ جب ابھی وہ کالج میں زیر تعلیم تھے تو منٹو کے افسانے 'چغد' کی طرز پر 'دس ہزار چغد' نام کا ایک افسانہ مزاحیہ انداز میں تخلیق کیا۔ اس کے علاوہ ایک اور افسانہ 'تمنا' کے نام سے لکھا تھا۔

بلند اقبال آج ایک ادیب اور افسانہ نگار کے طور پر معروف ہو چکے ہیں، نیز پیشہ ورانہ طور سے ان کی شناخت ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مستحکم ہو چکی ہے، لیکن حالات ہمیشہ ایسے نہیں تھے۔ ابتدائی دنوں میں انھیں معاشی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جب انھوں نے پاکستان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر لیا تو چار پانچ برس شدید معاشی بحران کا شکار رہے۔ اسی دوران یہ خیال جاگزیں ہوا کہ میڈیسن کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیے بغیر معاشی صورت حال تبدیل نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان میں رہتے ہوئے چند امریکی امتحانات پاس کر لیے۔

اس کے بعد امریکا پہنچ کر نیو یارک میڈیکل کالج سے پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ ظاہر ہے یہ مشکل وقت تھا لیکن بلند اقبال نے اس مشکل وقت کو بہت خوش اسلوبی سے گزار دیا، چنانچہ وہ 'میری کہانی' میں لکھتے ہیں:

> اس درمیان میں ظاہر ہے خاصا مشکل وقت بھی دیکھنا پڑا اور جو بھی معاشی مسائل ملے، ان سے نبرد آزما بھی ہونا پڑا، جن میں نیو یارک اور شکاگو کی سرد ترین راتوں میں پٹرول پمپ بھرنے سے لے کر اخبار اور بن کباب بیچنے تک کے کام بھی شامل رہے، مگر ان سب کاموں نے میری ذہنی بلوغت اور نشو ونما میں خاصا کردار ادا کیا۔ (43)

بلند اقبال نے معاشی بحران سے نبرد آزما ہونے کے لیے خواہ کتنی مشکلات کا سامنا کیا ہو، لیکن بالآخر وہ مشکل وقت گزر ہی گیا۔ یہاں ایک بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ممالک میں دورانِ طالب علمی کسی بھی طرح کا غیر علمی کام یا جیب خرچ نکالنے کے لیے کوئی کام کرنا خاصا معیوب سمجھا جاتا ہے، لیکن مغربی معاشرے میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہاں کے سماج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اضافی طور پر کچھ یافت بڑھانے کی کوئی سبیل پیدا ہو جاتی ہے تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ صبح سویرے کالج جانے سے پہلے پہلے ناظرین تک اخبار پہنچا دینا، ناشتے کا سامان فراہم کر دینا یا اس طرح کا کوئی بھی کام کرنا جس سے چند پیسوں کی یافت ہو جائے، کافی مستحسن تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کالج سے چھٹی کے بعد شام یا رات کو کسی ریسٹوراں میں دو چار گھنٹے ڈیوٹی دے دینا، کسی کو ٹیوشن دے دینا، جس سے کچھ اضافی آمدنی ہو جائے، کچھ ایسے معیوب کام بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلند اقبال اگر یہ کام کسی روایت زدہ مشرقی ملک میں کرتے تو شاید ذہنی طور سے آزمائش اور بحران سے دوچار ہونے کے مترادف ہوتا، لیکن مغربی ممالک میں اس قسم کے کاموں کو ہمیشہ استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلند اقبال نے سماج اور حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اضافی آمدنی کے لیے اضافی محنت بھی کی اور اس کام سے ان کو خاصی آسانیاں بھی پیدا ہو گئیں۔

بلند اقبال سنہ 1997ء تا 2000ء نیو یارک میڈیکل کالج سے منسلک رہے۔ بعد ازاں امریکن ڈپلومیٹ

کی ڈگری لے کر پورٹ لینڈ، اریگن منتقل ہوگئے، جہاں انھوں نے ڈاکٹری میں خصوصی مہارت حاصل کی۔

بلند اقبال کی شادی ان کے والد کے قریبی دوست کی صاحبزادی شجعیہ محمود سے ہوئی جو خود بھی حیدر آباد، سندھ کی رہنے والی ہیں۔ بلند اقبال اپنی والدہ سے بے حد متاثر تھے۔ چوں کہ ان کی والدہ ایک افسانہ نگار بھی تھیں، اس لیے شاید بلند اقبال سے ان کی ذہنی ہم آہنگی کچھ زیادہ تھی۔ ان کی موت سے قبل بلند اقبال کو تخلیقی عمل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کتابیں پڑھتے، ذہن وفکر کی تعمیر کرتے اور ایک خوب صورت مستقبل کا خواب دیکھتے، لیکن جب ایک مہلک بیماری میں ان کی والدہ اس دنیا سے چل بسیں تو اچانک ان کے اندر کا تخلیق کار بیدار ہوگیا۔ والدہ سے محبت، لگاؤ اور ان کے کھونے کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ بلند اقبال کی شخصیت فلسفیانہ راہوں پر چل نکلی۔ چنانچہ والدہ کی جدائی کے غم کا تجزیہ نیز اپنے فکری سفر کے ابتدائی مراحل کے بارے میں بلند اقبال لکھتے ہیں:

> سنہ 2002ء میں شادی کے محض تین یا چار ماہ بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری زندگی کے دھارے کو یکسر بدل دیا۔ اچانک میری والدہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور میں انھیں پاکستان سے امریکا اور کینیڈا لے آیا۔ مزید تشخیص سے پتہ چلا کہ انھیں جگر کا سرطان ہے جو بدقسمتی سے اپنی آخری حالت میں ہے اور یہ بھی کہ ان کی زندگی محض تین یا چار مہینوں کی ہی مہمان ہے۔ ان مہینوں میں مجھ سے جو بھی بس میں تھا، وہ میں نے کیا مگر بالآخر وہ نومبر کی اکیس تاریخ کو رحلت فرما گئیں۔ والدہ کی طبیعت کی خرابی کے دوران کم وبیش ہر رات میں بے بسی کے آنسو روتا رہا اور میرے اندر ایک کرائسس کا عمل چلتا رہا۔ میں نمازیں پڑھتا تو سجدوں میں خداوند تعالیٰ سے لڑتا تھا اور جب نمازیں نہیں پڑھتا تو اپنے آپ سے لڑتا تھا۔ ہر صبح میں انھیں موت سے اور قریب ہوتے ہوئے اور خود کو زندگی سے دور جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس سارے کتھارسس کو میں نے والدہ

کی وفات کے بعد لکھنا شروع کر دیا۔کبھی آزاد نظموں کی صورت تو کبھی
مضامین؛ یوں شاید میں اپنے غموں کا مداوا کر رہا تھا مگر وہ ساری تحریریں
محض جذباتی گفتگو نہیں تھی بلکہ ان میں غیرارادی طور پر میرا اب تک کا
شعور شامل ہورہا تھا۔ وہ تحریریں کبھی مجھ سے فلسفہ کی صورت نکلتی تھیں تو
کبھی ادب کی صورت۔ (44)

بلند اقبال کی اپنے والدہ سے محبت اوران کی جدائی کے کرب کو چند جملوں کی مدد سے مزید محسوس کیا جاسکتا ہے:

......میری ماں جنھوں نے زندگی میں تو میری تعمیر کی ہی تھی، جانے کے
بعد بھی میری زندگی کا راستہ متعین کرگئی۔ وہ جاتے جاتے دھیمے سے ایک
بند دریچہ کھلا چھوڑ گئی۔ وہ دریچہ جو پہلے کسی دھیان میں نہ تھا، پر جو کھلا تو
جیسے میرے گیان کا سبب بن گیا۔

...... میں سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کو افسانوی انداز میں لکھنے لگا تھا
اور یوں میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ نے مجھے ایک نئے راستے پر لا کھڑا
کیا۔شاید میری تخریب میں میری تعمیر کا عنصر تھا اوراس سارے عمل کے
پیچھے میری والدہ سے شدید رغبت تھی کہ ان کی موت میری اپنی موت کا
سبب بن گئی تھی، مگر میرا دوسرا جنم میری والدہ کی صورت مجھ میں ہوا تھا۔
چوں کہ وہ ایک بے انتہا محبت کرنے والی ماں کے علاوہ ایک خوب صورت
افسانہ نگار بھی تھیں۔ (45)

سابقہ سطور کی روشنی میں بلند اقبال کا نام اردو فکشن کی دنیا میں قطعاً نیا نہیں ہے۔اس دعوے کی پشت پر ان کے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، جو ہندو پاک کے موقر رسائل وجرائد میں گذشتہ پندرہ برسوں کے درمیان اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔

بلند اقبال کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی زیادہ تر کتابیں فکشن کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ان کی پہلی کتاب ''فرشتے کے آنسو'' سنہ 2007ء میں دنیائے ادب، کراچی سے شائع ہوئی تھی جس میں تیس افسانے شامل تھے۔ بلند اقبال کے لفظوں میں:

> ان افسانوں میں کیا نیا تھا یہ تو خیر تجزیہ نگار ہی بیان کر سکتے ہیں مگر یہ ضرور تھا کہ ان کہانیوں میں ایک سائنسی فکر رکھنے والے نئی دنیا کے شخص کے خواب تھے۔اس میں بوسیدہ سماجی اور مذہبی رسوم ورواج، فرد اور سوسائٹی کے نفسیاتی مسائل، اخلاقیات کے مصنوعی سماجی معیارات اور مشرق ومغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ سے تخلیق ہونے والے نئے معاشرے کی عمومی شکل پر کچھ جرأت مندانہ فطری سوالات اٹھائے گئے تھے جو شاید پڑھنے والے کو متاثر کر کے سوچنے پر آمادہ کر رہے تھے۔(46)

بلند اقبال کی اس کتاب کی پذیرائی خوب ہوئی۔مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے ایوارڈ دیے گئے۔اگلے برس یہ کتاب ہندی اور اردو میں جاوید انور صاحب کے توسط سے شائع ہوئی۔اس طرح ہندوستان کے قارئین نے بھی اسے دلچسپی سے پڑھا۔

بلند اقبال کی دو کتابیں ''میری اکیاون کہانیاں'' اور ''سارے ہی محبت نامے مرے'' سنہ 2013ء میں بالترتیب عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوئیں۔پہلی کتاب بلند اقبال کی بہترین اکیاون کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں ''فرشتے کے آنسو'' کی تمام کہانیاں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ جب کہ دوسری کتاب میں مختلف کتابوں پر تبصرے، نیز ادبی شخصیات پر لکھے گئے خطوط، تبصرے اور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

بلند اقبال نے صرف افسانے تخلیق نہیں کیے ہیں، بلکہ ان کا رہوارِ قلم ڈراموں کے میدان میں بھی رواں رہا ہے۔ بلند اقبال نے تخلیقی ڈراموں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان ہے: ''یہیں سے اٹھے گا شورِ

محشر' اور مکالموں کا مجموعہ ''کبھی دامن یزداں چاک'' ابھی منزل اشاعت میں ہے۔ڈرامے کی کتاب کے بارے میں خود بلند اقبال لکھتے ہیں:

> اس مجموعے میں شامل ڈرامے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، مثلاً
> گلوبل ورلڈ کے ارتقائی عمل میں کس طرح انسان اپنے نازک رشتے پامال
> کر رہا ہے، اور پھر کس طرح قدرت کی بینائیِ فکر مکافاتِ عمل کی صورت
> ان رشتوں کو استوار کرنے کا اشارہ دیتی ہے۔ (47)

اس کے علاوہ بلند اقبال نے ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کا جوہر دکھایا ہے۔ چنانچہ ان کا ایک ناول ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' متنازعہ علمی موضوع کی وجہ سے خاصا بحث طلب رہا تھا۔اس ناول کا موضوع وطن اور مذہب کے اس بنیادی تصور پر سوال قائم کرتا ہے کہ آیا یہ تصور تہذیبوں کے ارتقائی عمل کے دوران تربیت پانے والا ایک مصنوعی تصور ہے یا یہ تصور فطری اور اصلی ہے؟ یہ ناول سنہ 2016ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

بلند اقبال سنہ 2012ء میں ٹی وی میڈیا سے منسلک ہوگئے اور مختلف ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر سنجیدہ گفتگو پر مبنی پروگرام 'پاس ورڈ' کے نام سے پیش کرنے لگے۔ یہ ایک خاص قسم کا تجربہ تھا جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر بھی مباحثے کا آغاز کیا، پاکستان جیسے روایت پرست معاشرے میں جس کا تصور بھی محال تھا۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلابی دور میں بلند اقبال نے برق رفتار زندگی سے قدم سے قدم ملا کر اردو ادب کو ترقی کی نئی بلندیوں پر پہنچانے کا مزید ایک کارنامہ اس طرح سے انجام دیا کہ ٹی وی شو کے ذریعہ وہ دنیا کے بہت سارے ممالک کے شائقین ادب میں اپنی آواز پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دو ٹی وی پروگرام مرتب اور نشر کیے، 'دانائی کی تلاش میں' اور 'دی لائبریری وِد ڈاکٹر بلند اقبال'۔ یہ خالص علمی و ادبی طرز کے ٹی وی شو تھے۔ان کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان پروگراموں کو کتابی صورت میں مرتب کیا جا رہا ہے۔

بلند اقبال کا ایک اور ٹی وی پروگرام 'پاس ورڈ' بہت مقبول ہوا تھا۔ اس پروگرام کو امریکا اور کینیڈا کے علاوہ برصغیر میں بھی خاصی مقبولیت ملی تھی۔ چند برس قبل اس پروگرام کے چیدہ اور اچھوتے موضوعات پر پاکستان کے پروفیسر مبارک علی نے دو کتابیں ''تاریخ کی چھاؤں میں'' اور ''اندازِ بیاں'' کے نام سے مرتب کی تھیں۔

حال کے دنوں میں بلند اقبال نے اپنے والدین کی یاد میں ''معراج نسیم ورچول ہاسپٹل اور حمایت علی شاعر فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ایسے اسپتال کی بنیاد رکھی ہے جس میں ڈاکٹروں کی ٹیم مخصوص اوقات میں آن لائن مفید مشورے دے رہی ہے۔ یہ سبھی ڈاکٹر اپنے اپنے میدان کے ماہر ہیں۔ اسپتال کے قیام کا بنیادی مقصد دور افتادہ مریضوں کا علاج اور انھیں صحت کے متعلق مزید بیدار کرنا ہے۔ اس کے تحت خصوصی طور پر پاکستانی عوام اور عمومی طور پر تمام دنیا کے مریضوں کے لیے مفت مشورے کی سہولیات مہیا کرائی جا رہی ہیں جس کی بدولت مریض براہ راست یا پیغام کے ذریعے عالمی سطح کے ماہرین سے استفادہ کر رہے ہیں اور اپنی صحت کے تعلق سے مزید باخبر ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ ایک بہترین اور اپنی نوعیت کا انوکھا کام ہے۔

مغربی دنیا کے ادیبوں کا یہ عام وطیرہ رہا ہے کہ وہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا انٹرویو کرتے ہیں۔ مشرقی ملکوں میں بھی اس کا چلن ہے لیکن اس معاملے میں مغربی ممالک کہیں زیادہ دلچسپی اور ذوق سے اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ چنانچہ مغرب میں آباد اردو زبان و ادب کے جن ادیبوں کے بارے میں بھی معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہے، ان میں اکثریت ایسے ادیبوں اور دانش وروں کی ہے جنھوں نے مختلف ادیبوں اور اہل دانش سے مکالموں کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ خالد سہیل، عاشور کاظمی، تسلیم الٰہی زلفی، جاوید دانش اور اشفاق حسین جیسے ادیبوں کی خاصی تعداد ہے جنھوں نے انٹرویوز پر مشتمل کتابیں شائع کی ہیں۔ بلند اقبال کا مکالموں پر مشتمل ایک مجموعہ ''کبھی دامن یزداں چاک'' کے عنوان سے اشاعت کی منزل میں ہے۔ یہ دراصل وہ علمی مکالمات ہیں جو انٹرویو کی صورت مختلف ادبی، سیاسی، سماجی اور علمی شخصیات سے کیے گئے ہیں۔ ان انٹرویوز میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ ان موضوعات کو موضوعِ بحث بنایا جائے جن پر عام طور سے پاکستانی معاشرے میں گفتگو نہیں ہو پاتی، یا وہاں کے میڈیا چینل ان مباحث کو اپنے موضوعات نہیں بنا سکتے۔

اس نقطۂ نظر سے یہ کتاب خاصی دلچسپ ہوسکتی ہے۔ بقولِ بلند اقبال:

> ''میری اس کتاب کے پیچھے یہی خیال ہے کہ کسی طرح ہماری نوجوان نسلیں اپنے روایتی فکری حلقوں سے باہر نکلیں اور جدید معاشرتی فکر اور آنے والے سائنسی دور سے ہم کنار ہوجائیں۔''(48)

بلند اقبال کا مطالعہ ومشاہدہ وسیع ہے۔ انھوں نے مشرقی ومغربی ممالک کے زندگیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی جڑیں اگر ایک طرف مشرقی اقدار وروایات میں پیوست ہیں تو دوسری جانب انھوں نے مغرب کی نئی زندگی کے مسائل اور چیلنج کو بہت خوبی کے ساتھ قبول کیا ہے۔

بلند اقبال کی کہانیاں راست اندازِ بیان کے سہارے آگے بڑھتی ہیں، اور قاری کے ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت سے دنیائے ادب میں بلند اقبال کے ادبی قد وقامت میں اضافہ ہوا ہے، اور ایک ادیب کے طور پر ان کی شناخت مستحکم ہوئی ہے۔

بلند اقبال کی کہانیاں کسی مخصوص دائرے کی اسیر نہیں ہیں۔ انھوں نے زندگی کے بہت سارے موضوعات سے اپنے افسانوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔ اختصار نویسی ان کا بنیادی وصف ہے۔ فکشن میں اختصار نویسی کا فن مشکل ترین ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کا کمال یہی تھا کہ وہ مختصر کہانیوں میں زندگی کا زہر اتار دیتے تھے۔ یہی بات بلند اقبال کی کہانیوں پر صادق آتی ہے۔ وہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور زندگی کا فلسفہ براہِ راست زندگی سے اخذ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اشتراکیت اور جدیدیت سے کوئی انسلاک نہیں بلکہ وہ دونوں فلسفوں کے درمیان سے ایک علاحدہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں انسان اور انسانیت نوازی بنیادی تفہیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنی کہانیوں میں انسانی زاویوں کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلند اقبال کے موضوعات میں ایک ایسی ترقی پسندی پائی جاتی ہے جو انقلاب اور بغاوت سے عبارت نہیں، بلکہ اس میں جدید علوم کی برکتیں اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی ایجادات واختراعات کی روشنی شامل ہے۔ وہ انقلابی انداز نہیں اختیار کرتے بلکہ باغیانہ روش سے گزرتے ہوئے اپنے موضوع کو تازہ ترین علمی حوالوں سے

تقویت پہنچاتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ اپنے موضوعات کے انتخاب میں بھی انفرادیت کی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ان کا افسانہ ’کارٹون‘ محض ایک چھوٹی کہانی نہیں، بلکہ امت مسلمہ کے لیے ایک بڑا فکری المیہ ہے۔اسی طرح کی ایک کہانی ’پہلا پیار‘ ہے جو بچوں پر جنسی زیادتی جیسے معاشرتی جرم کے پیچھے کے نفسیاتی المیے کو ایک انوکھے زاویے سے سامنے لانے کی کوشش ہے۔افسانہ ’’نہیں‘‘ مسلم معاشرہ اور خاص طور سے عورت کی ایسی کہانی ہے جس میں وہ کسی بھی صورت میں اپنے گھر کے اندر سوکن برداشت نہیں کرسکتی۔’’سہاگ رات‘‘ ترقی پسندی اور مذہب کے بیچ پھنسے ہوئے ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو اعلیٰ تعلیم سے تو آراستہ ہے، لیکن مذہبی روایات سے اس کا دامن ابھی بھی الجھا ہوا ہے۔اس کہانی کا ایک المیہ پہلو یہ بھی ہے کہ برصغیر میں مذہب چند ظاہری روایات میں محصور ہوکر رہ گیا ہے۔’’یہ کیسی بے وفائی‘‘ ہم جنسی کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔اردو میں اب یہ موضوع پرانا ہوگیا ہے لیکن جس انداز سے بلند اقبال نے اسے برتا ہے، نیز راوی نے جس طرح اس کہانی کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔بلند اقبال کے متنوع موضوعات سے گفتگو کرتے ہوئے جاوید انور نے لکھا ہے:

> بلند اقبال نے اپنے افسانوں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے
> ان میں سے بیشتر ایسے تجربے ہیں جو اس سے قبل بہت کم کیے گئے ہیں،
> اور جس سے جدوجہد کرتے ہوئے یہ فن کار اپنے دور میں انھیں سر کرنے
> کی تلاش میں سرگرم ہے۔ان نئے مسائل کا انسلاک، زمینی، علاقائی،
> سیاسی، نفسیاتی اور بنی نوع انسان کے شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری
> مسائل سے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فردیت کے عجیب وغریب الجھتے
> ہوئے تصورات سے بھی ہے۔(49)

بلند اقبال کے فکشن کے موضوعات ومسائل

بلند اقبال کے ان افسانوں کی تعداد بے حد کم ہے جن میں کینیڈائی زندگی کے مسائل کو براہِ راست موضوع

بنایا گیا ہو۔ دیگر افسانہ نگاروں کے برخلاف ان کے یہاں کینیڈائی حیات و کائنات کے مسائل کی ترجمانی کی مقدار بہت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شاید بلند اقبال کینیڈائی معاشرے میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ انھیں اب اس طرزِ حیات میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

بلند اقبال کے ان افسانوں کی تعداد خاصی ہے جن کے پس منظر میں پاکستانی معاشرہ نظر آتا ہے۔ ان میں پاکستانی سماج کے تانے بانے نیز معاشرتی پیچیدگیوں کو ابھارنے کی جدوجہد ملتی ہے، لیکن یہ جدوجہد ہمیشہ نئی طرز کی حامل ہوتی ہے، اور نقطۂ نظر بالکل انوکھا اور غور وفکر پر آمادہ کرنے والا ہوتا ہے۔ ان کہانیوں کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلند اقبال جسمانی طور سے تو کینیڈا کی سرزمین پر بستے ہیں لیکن ان کی کہانیاں ذہنی طور سے انھیں پاکستان میں روکے رکھتی ہیں۔ اس کی مزید ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بلند اقبال کا دل وطن عزیز کی بہتری، خوش حالی اور زندگی کے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کی اشاعت کے لیے بے چین رہتا ہے، یہ اضطراب اور بے چینی انھیں پاکستانی معاشرے سے بے نیاز نہیں رکھ پاتی۔

بلند اقبال کو کینیڈا کا صحت مند معاشرہ متاثر تو کرتا ہے لیکن پاکستان کی روایت پرستی ان کی روح کو مضطرب بھی رکھتی ہے۔ پاکستان کی بدحالی اور روایت پرستی، سماجی بے ضابطگی پر ان کا قلم بے باک انداز میں رواں رہتا ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ انھیں موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، اور قاری کے ذہن کو آگہی اور دیدو دانش کی ایک نئی دنیا طرف لے جاتے ہیں، نیز ایک صحت مند معاشرے کا خواب دیکھتے دکھاتے ہیں۔

بلند اقبال کے افسانوں کو الگ الگ موضوعات کی درجہ بندی میں اسیر کرنا چیلنج بھرا کام ہے۔ ان کے افسانوں کی سکہ بند تقسیم بظاہر ممکن نظر نہیں آتی، اس کے باوجود اگر ان کی درجہ بندی کی جائے تو درج ذیل عناوین کے تحت ان کے افسانوں کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ ہاں، اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ بلند اقبال کی کہانیوں میں جو ٹریٹمنٹ ہوتا ہے، یا اثر پذیری کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ خارج سے زیادہ داخل کو متاثر کرتی ہے۔

ہجرت اور مہاجرین کے مسائل

یہ بات گزر چکی ہے کہ بلند اقبال کی کہانیوں میں ہجرت اوراس کے پیدا شدہ مسائل کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالباً وہ مغربی معاشرے میں اس قدر گھل مل چکے ہیں کہ ہجرت کے مختلف مسائل اب ان کی کہانیوں کا موضوع نہیں بن پاتے۔ پھر بھی ان کی بعض کہانیاں ایسی ہیں جو ہجرت اور مہاجرین کے پس منظر سے تیار کی گئی ہیں۔مہاجرین کی نفسیات اوراندرون کی کش مکش کو بلند اقبال نے بھی سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان کا ایک افسانہ ہے''ادھورا کافر''اس میں ایک مہاجر کا درد پوشیدہ ہے جو ایک خاص قسم کی ناسٹلجیائی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہ ایک ایسے فرد کا المیہ ہے جو اپنی شدید ذہانت اور متجسس فطرت کی بدولت مشرق سے مغرب تک کا سفر طے کرتے ہوئے دنیاوی ترقی کے اعلیٰ ترین منازل پر پہنچ چکا ہے۔ جبران انتہائی ذہین لیکن غیر مذہبی آدمی تھا۔ وہ حسن وعشق کے فلسفوں کا متلاشی تھا، اور زندگی کے جنسی رازوں اور رویوں سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا۔اس نے نیلوفر سے شادی تو کی لیکن جلد ہی ازدواجی زندگی کے تکلفات اس کے پاؤں کی زنجیر بننے لگے۔ چنانچہ وہ نیلوفراور دوسالہ بچی کو چھوڑ کر امریکا میں جا کر آباد ہوگیا۔امریکا کی ذہنی، معاشی اور جنسی آزادی کی فضا اسے بہت راس آئی اور وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا ہی چلا گیا۔ دنیاوی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے باوجوداس کی شخصیت ایک خلا سے بار بار ٹکراتی تھی۔اس کی زندگی میں حالاں کہ مذہبی اقداراور خاندانی رسوم ورواج کی کوئی اہمیت نہیں تھی، مگر ایک کانٹا اس کے دل میں ہمیشہ چبھتا رہتا تھا۔اس کی دوسالہ بیٹی اس کے خیالات کو منتشر کر دیتی اور جبران اس کی یاد میں گھنٹوں روتا رہتا تھا۔

کہانی میں ایک مہاجر کی زندگی کے المیے کو احساس کی شکل میں پیش کر کے بلند اقبال نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اور خصوصاً مہاجرین اگر چہ شدید باغیانہ رویوں کی بدولت مشرقی روایتی تصورات سے بے گانہ ہوجاتے ہیں، لیکن تمام تر ترقی کے باوجودان کی شخصیت کا خلا پر نہیں ہو پاتا۔ جڑوں سے کٹے ہوئے درخت کی شادابی عارضی ہوتی ہے۔مغرب کی آزاد فضائیں اگر چہ مہاجر کو مشرق کے تئیں اجنبی بنا دیتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب کی چکاچوند میں زندگی انھیں تنہا بھی کر دیتی ہے۔ یہ کہانی مشرقی اقدار کے باغی، مغرب کے کامیاب ترین فرد کی ذہنی بلوغت کے المیے کو پیش کرتی ہے جہاں وہ اپنی معصوم بیٹی کے لیے بے چین رہتا ہے۔افسانہ نگار

نے یہاں فرد کے المیے کو واضح کیا ہے اور بیٹی کے تعلق سے اس کی فکرمندی کو مرکز میں رکھا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی کہ ترقی یافتہ اور ذہین جبران بیٹی کے مستقبل کے تئیں فکرمند تھا، یا اسے بیٹی کی تنہائی اور بے بسی مضطرب رکھتی تھی، اور کس کو پتا کہ جبران اپنی تنہائی کے سانپوں سے تنگ آ چکا تھا۔

ہجرت کا کوئی ایک پہلو نہیں ہوتا۔ اس کے ہزار رنگ ہیں، اور ہر رنگ ایک دوسرے سے ممتاز و مختلف۔ چنانچہ ان کی ایک کہانی ''Pledge of Allegiance'' ایک ایسے بیٹے کی کہانی ہے جو اپنے باپ سے ناراض ہو کر پردیس میں آباد ہو گیا ہے۔ اور جب اسے اس کے والد کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو اس کے اندرون کی کش مکش کو لفظوں میں پرونے کا کام بلند اقبال نے کیا ہے۔

پاکستان کا ایک شخص اپنے باپ سے ناراض ہو کر امریکا چلا جاتا ہے، یعنی مہاجرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ وطن میں اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے جس کی اطلاع اس کا بھائی اسے فون کے ذریعہ دیتا ہے۔ چودہ برس سے ناراض بیٹے پر باپ کی موت کی خبر کا کیا ردعمل ہوتا ہے، یہی کہانی کا مرکزی خیال ہے۔

بلند اقبال کے جملے خوابیدہ جذبات کو جھنجوڑتے ہیں، وہ احساسات کے ان تاروں کو حرکت دینے کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں جن سے زندگی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں تموج پیدا ہونے لگتا ہے۔ انھیں دل کے تاروں کو چھیڑنے کا سلیقہ آتا ہے۔ فضا آفرینی وہ ایسی کرتے ہیں کہ گرد و پیش کے جملہ مظاہر دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ تمام تر ترقی اور دنیاوی آسائش کے باوجود باپ کے انتقال کی خبر سن کر بیٹے کے دل و دماغ میں مہیب خاموشی بس جاتی ہے۔ اس کا اندرون خالی اور ویران ہو چکا تھا۔ اس جذباتی افسانے میں ہر بیٹے کی کہانی موجود ہے جو باپ سے جدا ہو گیا ہے۔ باپ بیٹے کے بظاہر تلخ اور بہ باطن نرم و نازک رشتوں پر یہ کہانی مشتمل ہے۔ مذہب اور وطن پرستی کے جذبات جس طرح مصنوعی طور سے انسانوں کے ذہن میں پیوست کیے جا رہے ہیں، ایسی صورت حال پر بھرپور طنز ہے، کہانی کے چند متفرق جملوں سے بلند اقبال کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے گا:

> اٹھارویں منزل سے آس پاس کی تمام ہی عمارتیں اسے کھلونوں کی طرح
> نظر آ رہی تھیں۔

مجھے یاد ہے کس قدر خشمگیں نگاہوں سے مٹھّیاں بھینچ کر مجھے دیکھتے ہوئے

تو اسکول کے بچوں کو قومی ترانہ یاد کرا رہا تھا اور میں شوخ نگاہوں سے تجھے

چڑا رہا تھا...... میں نے یہی تو کہا تھا نا کہ میں ہر چوبیس گھنٹے کے بعد

وفاداری کا یہ گانا نہیں گا سکتا...... ماں سے محبت تو پیٹ سے ہی بچے میں اتر

آتی ہے پھر یہ Pledge of Allegiance کی گردان کیوں؟

......صرف یہی تو میں نے کہا تھا کہ ایمان تو خون میں شامل ہوتا ہے، پھر

ہر چار چھ گھنٹے کے وقفے سے Pledge اور Repledge کی

کیا ضرورت ہے؟ Patriotism اور Religion دونوں ہی تو

فطری عمل ہیں۔ (54)

یہ کہانی باپ بیٹے کی مفارقت کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے اور اپنا آشیانہ اجنبی زمینوں پر بنالے، فطری رشتوں کی گرمی اس کے دل کو نرم و گداز بنائے رکھتی ہے۔ عارضی طور سے مصلحت کی سخت و سرد چادر اگر ان رشتوں پر تانی جاتی ہے، تو وہ دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ کسی بھی واقعے یا زندگی کے نازک لمحے کی بدولت رشتوں کی گرماہٹ اپنے فطری انداز میں واپس آجاتی ہے۔

بلند اقبال نے کہانی میں زبان کا استعمال بھی بے حد فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ صرف اشارتاً چند معنی خیز جملے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر میں فیکس مشین سے ایک کاغذ نکل کر زمین پر گر گیا۔ اس نے

ڈوبتی نظروں سے کاغذ کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل

گئی۔ (55)

واقعہ یہ ہے کہ اس شخص کا باپ مرگیا ہے، بلند اس کا اظہار یہ لکھ کر کرتے ہیں کہ: کاغذ زمین پر گر گیا ہے۔ اس سے ذہن شنیدہ روایت کے اس فرضی درخت کی طرف منعطف ہوتا ہے کہ درخت سے پتے گرتے ہیں اور ان

پتوں پر جس کا نام درج ہوتا ہے، اس کی زندگی کا دفتر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ انتقال کی خبر سن کر اس کا دل تو ڈوب گیا تھا، اب نظریں ڈوب رہی ہیں، لیکن چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی ہے، یعنی موت کے باوجود اس کا غم ختم ہورہا ہے، برسوں کی کسک مٹ رہی ہے، سینہ غبار سے دھل رہا ہے۔ موت مسکراہٹ کا پیغام لائی ہے، ایک ایسی مسکراہٹ جس کو پانے کے لیے اس نے چودہ برس تنہا گزار دیے۔ کہانی کا یہی رجائی انداز اسے بے حد حساس اور نرم کہانی بنا دیتا ہے۔

مہاجرین کی نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ نئے ملک میں وہ ہزار عیوب تلاش کرتے ہیں، اور ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کی اکثریت ان ملکوں کو چھوڑنا گوارا بھی نہیں کرتی۔ اس کا نقصان اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ مہاجرین نئی زمینوں سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور وہ اس سرزمین کے لیے اجنبی ہی رہ جاتے ہیں۔ اس سے جڑا ہوا معاملہ منافقت کے جذبے کا بھی سامنے آتا ہے۔ نئے ملک کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ اور احترام کا کوئی جذبہ نہیں لیکن معاش کی مجبوری انھیں منافقت کے راستے پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے بلند اقبال کی ایک کہانی جس کا عنوان ہے ''بنا پیندے کے لوٹے''۔

یہ کہانی رپورتاژ کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ پاکستان سے ایک جہاز امریکا جارہا ہے، اس میں راوی نے پاکستانی مہاجرین و مسافرین کی ذہنی کیفیات کی عکاسی ان کی گفتگو کی روشنی میں کی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ منافقت کی چادر لپیٹے ہوئے ہے۔ جہاز کے مسافر مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم اور اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے امریکا کے دست نگر بننے کے تضاد سے دوچار ہیں۔ ایک صاحب تبلیغ کے لیے امریکا جارہے ہیں، شاید امریکا کو ہی رشد و ہدایت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ دوسرے صاحب مادی دولت و ثروت سے آسودہ حال ہیں لیکن حکومت امریکا کے قانون کا فائدہ اٹھا کر بینک کرپسی فائل کر چکے ہیں۔ کوئی صاحب امریکا ہی کو گالی دیے جارہے ہیں، اور کمائی بھی وہیں سے کرتے ہیں۔ کچھ لوگ مشرقی تہذیب کی فضیلت کا ذکر کر رہے ہیں اور امریکا جانے کی جگت میں لگے ہوئے ہیں۔ خواتین بھی امریکا کو برا بھلا کہہ رہی ہیں، اور برسوں سے قیام اسی سرزمین پر ہے۔ دراصل اس کہانی میں طنزیہ ومزاحیہ انداز میں ایسے افراد کو نشانہ بنایا گیا ہے جن کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں، منافقت نے ان کے دل و دماغ میں گھر بنالیا ہے، اور وہ کسی بھی قیمت پر مادہ پرستی حاصل کرنے کو عیب نہیں سمجھتے۔

دین وایمان، خودداری اوراخلاص ووفاداری ان کے لیے کتابی اور غیر عملی الفاظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

افسانہ ’’ابال‘‘ اس کرب کی کہانی ہے جس کی وجہ سے خوش حالی کے خواب ہمیں مٹی کے گھروں سے اٹھا کر غیرملکوں میں آباد تو کر دیتے ہیں، لیکن مشترکہ خاندانوں کی تہذیب اور سچے خلوص و پیار کی محرومی کی شکل میں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے دودھ کو تاریخی اور تلمیحی سیاق میں استعمال کرتے ہوئے اس کی معنوی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

خواتین کے مسائل

بلند اقبال کی کہانیوں میں خواتین کے مسائل پر بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔ ان کی کئی کہانیاں ایسی ہیں جو خواتین کے مختلف مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ کہیں عورت کے استحصال کی کہانی ہے اوراس کا رشتہ صدیوں کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں تلاش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ بعض کہانیاں ایسی ہیں جن میں خواتین کی نفسیات کو مرکز میں رکھا گیا ہے۔ کچھ کہانیوں میں عورت کی محبت اوراس کے ٹوٹتے بکھرتے رشتوں اوراس بکھراؤ میں بھی نیا راستہ تلاش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ایسا ہی ایک افسانہ ہے ’’پراسرار مسکراہٹ‘‘ جس میں عورت کی نفسیات کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔

اس افسانے میں ایسی عورت کی ذہنی کیفیت وکرب کا نقشہ اتارا گیا ہے جو اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی، اور بہ حالت مجبوری اس کے ساتھ رہتی ہے۔ رقیہ کے تخیل میں خوابوں کا شہزادہ رہتا ہے لیکن حقیقت میں قیوم میاں اس کے نازک اور خوب صورت احساسات کو پامال کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ شدید بیزاری اور الجھن کا شکار رہتی ہے، اور آخرکار ایک ممکنہ نتیجہ اس کے ہونٹوں پر تبسم کی لکیر کھینچ دیتا ہے۔ ناپسندیدہ شوہر سے نجات پانے کا راستہ؛ اور اس خیال کے آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگتی ہے۔ ناپسند شخص کے ساتھ رہنے، اس سے جنسی وجذباتی تعلق استوار کرنے اوراس سے ہم آغوشی کا کرب برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ اس سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ نجات خواہ اسی کے ہاتھوں قتل ہو کر ہی کیوں نہ ملے، عورت کو یہ بات گوارا معلوم ہوتی ہے۔ گویا اس کہانی میں عورت کی اس نفسیات کو روشن کیا گیا ہے کہ ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا پانے کے لیے عورت کسی بھی

سطح تک جاسکتی ہے خواہ اسے خود ہی قتل کیوں نہ ہونا پڑے۔

سماجی تناظر میں خواتین کے استحصال اوراس کی مظلومی کی داستان کو بیان کیا گیا ہے ''ید بیضا'' میں۔ یہ عورت کی مظلومی کی سیدھی سادی کہانی ہے لیکن کہانی میں تلازمات اور تلمیحی حوالوں کے استعمال سے اس میں معنویت اور پہلوداری پیدا ہوگئی ہے۔ موسیٰ عاشق ہے جو زینب سے محبت کرتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر زینب کو اپنا مال سمجھتا ہے، صرف معشوق کی شکل میں نہیں بلکہ شوپیس کی طرح رکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زینب صرف اس کے لیے ہو، کوئی اور اس کو نہ دیکھ سکے۔ زینب اپنی شناخت کی تلاش اور شخصیت کا اظہار چاہتی ہے۔ آخر کار موسیٰ نے زینب کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا، اس کا چہرہ بدنما اور مکروہ نظر آنے لگا۔ وہ چہرہ اب ایک دو نہیں ہزاروں لاکھوں افراد کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ زینب جو پہلے سیکڑوں حسیناؤں کی بھیڑ میں محض ایک فرد تھی، اب موجودہ شکل و صورت میں واحد بن گئی ہے۔ بہر حال جب بھیڑ اکٹھا ہوئی، اور موسیٰ کو گناہ کا احساس ستانے لگا تو اس نے خود کو بھیڑ کے حوالے کر دیا۔

اس کہانی میں کئی تلمیحی پہلو موجود ہیں، جو عورت کی مظلومیت کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ پیغمبر موسیٰ کے ہاتھ بچپن میں آگ پکڑ لینے کی وجہ سے جل کر سفید ہو گئے تھے۔ خدا نے اس کو معجزے میں تبدیل کر دیا۔ گویا تاریخ میں موسیٰ کا جلا ہوا ہاتھ مظلومیت کی علامت تھا۔ آج عصر حاضر میں موسیٰ زینب پر تیزاب پھینکتا ہے اور اس کا چہرہ جل کر، سیاہ ہو کر ید بیضا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ موسیٰ آج ظالم بن گیا ہے۔ موسیٰ مرد کا استعارہ اور زینب مظلوم عورت کی علامت ہے۔

کہانی نفسیاتی زاویہ بھی رکھتی ہے۔ موسیٰ نے زینب کے چہرے پر تیزاب صرف اس لیے پھینکا تھا کہ وہ صرف اسی کی توجہ کا مرکز رہے۔ اس کا محبوب بہر حال اس کا محبوب ہی رہے، لیکن اس کے اقدام کی وجہ سے زینب لاکھوں لوگوں کی نگاہوں میں آ گئی۔ یہ موسیٰ کی شکست تھی۔ اسی احساسِ شکست نے اسے خود کو بھیڑ کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو ایک طرح سے اس کے تزکیۂ نفس کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔

بلند اقبال کی کہانیاں غور و فکر پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ ان کی کہانی کئی بار سیدھی سادی ہوتی ہے لیکن اس کے

پردے میں جو سوالات قائم کیے جاتے ہیں، وہ اضافی غور وفکر کا مطالبہ کرتے ہیں، اور قاری کے جذبات کو داخلی سطح پر زیادہ متاثر کرتے ہیں۔

''پھٹا ہوا دامن'' فیشن اور ترقی کے نام پر عورت کے استحصال کی کہانی ہے۔ کہانی میں زرینہ ایک ماڈل ہے، یوسف اس کا ڈریس ڈزائنر ہے۔ ڈریس کی نمائش کے لیے ریمپ سج گیا ہے، اور ماڈل ایک ایک کر کے ریمپ پر آ رہے ہیں۔ عین موقعے پر زرینہ کے ڈریس کی چند جھالروں کو یوسف کم کر دیتا ہے جس سے زرینہ کا سراپا مزید قیامت بن جاتا ہے۔ ریمپ پر چلتے ہوئے اچانک زرینہ کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو کر شائقین کی صفوں میں لڑھکتی ہوئی جا گرتی ہے۔ زرینہ اس موقعے پر جس نفسیاتی کیفیت سے دوچار ہوئی ہے، وہی اس کہانی کا مرکزی نقطہ ہے:

> زرینہ کو کیا پتا تھا کہ اچانک یہ ایک چھوٹا سا کڑا لمحہ صدیوں کی تاریخ خود میں سمیٹ کر اسے زرینہ سے زلیخا میں بدل دے گا۔ اس چھوٹے سے لمحے میں جب زرینہ اوروں کے لیے بے ہوش ہو کر ریمپ سے شائقین میں گری تھی، اسی لمحے تو زرینہ زلیخا میں بدل کر بازارِ مصر پہنچ گئی تھی اور یوسف کا دامن پیچھے سے پکڑ کر چیخ رہی تھی کہ میں نے تمھارا دامن تو پیچھے سے پھاڑا تھا مگر تم تو نبی تھے نا! دیکھو تمھاری خود کی خاطر کی گئی جرح سے میرا دامن ہمیشہ کے لیے پیچھے آگے دونوں ہی طرف سے پھٹ گیا ہے۔ (56)

یہ کہانی بھی تلمیح کے کندھے پر سوار ہو کر عصر حاضر تک پہنچتی ہے، اور یہاں تک آتے آتے فیشن اور ترقی کے پردے میں عورت کے استحصال کا المیہ بن گئی ہے۔ تاریخ کے یوسف کو بازارِ مصر میں فروخت کیا گیا تھا۔ وہاں سے وہ عزیز مصر کے محل میں پہنچا جہاں زلیخا نے آتش عشق میں جل کر اس کا دامن چاک کر دیا تھا، اور پھر سر محفل ساری مصری زلیخاؤں نے حسن یوسف کو دیکھ کر محویت کے عالم میں اپنی اپنی انگلیاں زخمی کر لی تھیں۔ اب بازار اور دربار بدل گئے ہیں۔ دربار و بازار کی جگہ اب ریمپ آ گئے ہیں جس میں دربار کی شان وشوکت اور تجمل، بازار کی

رونق اور سرگرمی ہے۔ تاریخ میں زلیخا نے یوسف کا دامن ایک بار چاک کیا تھا، وہ بھی پیچھے سے؛ اب نئے دور کا یوسف زلیخاؤں کے دامن چاک کرتا پھر رہا ہے، اور صرف پیچھے ہی نہیں بلکہ ہر سمت سے اور ہر زاویے سے وہ عورت کے جسم کے خطوط کی نمائش کر رہا ہے۔ ریمپ پر تو سبھی زلیخاؤں کے دامن چاک ہیں، نیز ریمپ صرف لباس کا ہی نمائشی اسٹیج نہیں رہ گیا ہے بلکہ جسم کی گرم بازاری بھی ہے جہاں جسم کے خطوط شائقین کو زخمی کر رہے ہیں۔ اب زلیخا کے بجائے ظالم بن کر یوسف چاک دامانی کر رہا ہے، اور زلیخا مظلومیت اور بے بسی کی علامت بن گئی ہے۔ زرینہ صرف ایک کردار نہیں بلکہ صدیوں کی استحصال کا استعارہ ہے، شائقین کی صفوں میں سب استحصالی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ افسانہ عورت کے استحصال کی کہانی کو اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ زلیخا کی عصیاں مزاجی ایک طرف لیکن یوسف نبی ہونے کے باوجود استحصالی ذہنیت کے ساتھ آج بھی زرینہ کو سر بازار نیلام پر چڑھا رہا ہے۔ ان معنوں میں مرد طبقہ زیادہ جارح اور ظالم نظر آتا ہے۔

نفسیاتی مسائل

بلند اقبال کی ایک کہانی ''نہیں'' ہے جس میں ایک شادی شدہ عورت کی نفسیات کی پرتوں کو کھولنے کی کوشش ملتی ہے۔ عورت ذہنی طور پر خواہ بلوغت کی کسی بھی منزل میں پہنچ جائے اس کے اندر کی عورت اور اس کی فطرت ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ چنانچہ اس کہانی کا کردار آپا ایک سلیقہ شعار خاتون، فرماں بردار بیوی، اور سماج کی دین دار فرد ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں مذہب و شریعت کے معاملات سے خاطر خواہ واقفیت ہے۔ ان کا کوئی عمل دین کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہوتا۔ میاں جی سے شادی کے چودہ برس گزرنے کے بعد لاکھ کوشش کے باوجود جب ان کی گود ہری نہیں ہوئی تو ان کے میاں نے ایک دن صرف حصولِ اولاد کی خاطر دوسری شادی کی اجازت ان سے طلب کی۔ عورت کی فطرت میں سوکن کو برداشت کرنے کا جذبہ غالبًا کاتب تقدیر نے رکھا ہی نہیں۔ کیوں کہ تمام تر علم و فضل کے باوجود آپا اتنی زور سے چیخیں کہ گھر کے در و دیوار کانپ اٹھے۔ کہانی میں بلند اقبال نے عورت کے اسی فطری داعیے کو ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ عورت زندگی کی ہر کسوٹی پر کھری ہو سکتی ہے، وہ زندگی کے

سخت سے سخت مصائب کو خندہ پیشانی سے سہہ سکتی ہے لیکن سوکن کا عذاب نہیں برداشت کر سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبعی طور پر عورت کو پیار میں شرکت کسی صورت بھی گوارا نہیں، یہ اس کے فطری مزاج کے خلاف ہے۔

عورت خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہو، تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ؛ مذہبی اور روایتی رنگ میں ڈوبی ہو یا ماڈرن طرزِ زندگی کی پروردہ ہو، شریک حیات میں اسے شرکت گوارا نہیں۔ ''نہیں'' میں اسی مسئلے کو اجاگر کیا گیا ہے۔

نفسیاتی مسئلے کا احاطہ کرتی ان کی ایک کہانی ہے ''نروان''۔ ہجرت اور نفسیات کی بھول بھلیوں میں الجھی ہوئی ایک کنبے کی یہ کہانی انسانی نفسیات کی کئی پیچیدگیوں کو واضح کرتی ہے۔ اس کہانی میں انسان اور اس کی قلب ماہیت کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ ''نروان'' ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے دو بچوں کی نفسیاتی اور قلب ماہیت کی پیچیدگیوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ نروان یعنی نجات؛ کس قدر مختلف تصور ہے۔ ایک ہی گھریلو فضا میں تربیت یافتہ بچے دو الگ الگ سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ دونوں ہی زندگی کے رازوں کے متلاشی ہیں۔ مسز رحمان اور ڈاکٹر رحمان گذشتہ اٹھارہ برسوں سے امریکا میں مقیم ہیں۔ ان کے دو بچوں میں لڑکی مونی اور لڑکا شہروز ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لڑکی ہم جنسی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے، اور اسی اسے وہ اپنی تکمیل کرنا چاہتی ہے۔ دوسری طرف بیٹا خالص مذہبی رنگ میں شخصیت کی تکمیل کر رہا ہے۔ اسے امریکا کا سارا نظام سودی، خلافِ شریعت اور استحصالی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ان تمام دنیاوی تکلفات اور آسائشوں سے خود کو علاحدہ کرتے ہوئے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر رحمان کے دونوں بچے اسی آزاد معاشرے کے فرد ہیں جہاں ہر بالغ کو اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہے، اور وہ فیصلہ کرتے بھی ہیں۔ یہ کہانی انسانی نفسیات اور مغرب کی مادہ پرست دنیا کی گرہوں کو کھولتی ہے، اس طور پر کہ زندگی کبھی سیدھے سادے اور منصوبہ بند پروگرام کے تحت نہیں چلتی بلکہ وہ اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں جہاں ایک طرف انتہائی مادہ پرستی کی مثالیں اور رجحانات سامنے آتے ہیں، وہیں ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں جہاں مادہ پرستی کی معراج پر پہنچ کر افراد روحانیت میں پناہ تلاش کر رہے ہیں۔

بلند اقبال کے افسانوں میں اجتماعی مسائل کی ترجمانی خال خال نظر آتی ہے۔ وہ فرد کی ذات کے نہاں

خانوں میں متحرک جذبات کے افسانہ نگار ہیں۔کسی واقعے یا عمل کا اثر انفرادی طور سے فرد پر کس طرح مرتب ہوتا ہے، وہ اس اثر کی ڈوبتی ابھرتی لہروں کو گرفت میں لاتے ہیں۔معاشرے کی اجتماعی ساخت اور نفسیات پر اس کے اثرات سے وہ بحث نہیں کرتے۔دوسری بات یہ ہے کہ بلند اقبال کے افسانوں میں جیسا کہ سابقہ صفحات میں مذکور ہوا ہے کہ تلمیحی شخصیات و کردار سے وہ نئے نئے خیالات اور غور و فکر کی دنیا آباد کرتے ہیں، اسی طرح چوں کہ وہ پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں، اس لیے انھوں نے افسانوں میں سائنس اور طب کی اصطلاحوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس نے سائنس اور طب کی دنیا سے آگہی حاصل کی ہو۔بلند اقبال کی ایسی کئی کہانیاں ہیں جس میں طبی اور طبعی طور پر انسان کے مطالعے کی کوشش ہے۔'میوٹیشن' اور 'آدھا مرد' میں اسی طبعی تبدیلی کے موضوع کو برتا گیا ہے۔'میوٹیشن' کا کردار علی بخش نارمل انسان تھا، انتہائی پرہیزگار، اور مذہبی ماحول کا پروردہ، لیکن اچانک اس کا جسم طبعی تبدیلی سے دوچار ہونے لگا اور اس کے جسم کے اعضا بے ادبی کی حد تک لباس سے باہر نکلنے لگے۔ظاہر ہے سائنسی اور طبی طور سے اس کا جواز تو ہے لیکن مذہبی اور پرہیزگار فرد کے لیے یہ بیماری ایسا عذاب بن کر آتی ہے کہ اس کی باقی ماندہ زندگی کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔یہ کہانی فرد کے اسی داخلی المیے کا احاطہ کرتی ہے۔دوسری کہانی 'آدھا مرد' میں بھی وہی نفسیاتی مسئلہ موجود ہے کہ شوہر اچانک طبعی احساس کی تبدیلی سے گزرتا ہے، اور اپنی بیوی کے کپڑوں میں ملبوس اور خود کو زیورات سے سجا سنوار کر خاص قسم کی طمانیت محسوس کرتا ہے۔

بلند اقبال ان احساسات کو بھی گرفت میں لینے کا سلیقہ رکھتے ہیں جو عام طور پر دوسرے قلم کاروں کی حسیات کا حصہ نہیں بن پاتے۔انسانی نفسیات کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے، اس کے نہاں خانوں میں خواہشوں اور حسرتوں کے کتنے سانپ پلتے ہیں، اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔''کوڑے جو درد سے چیختے تھے'' یہ احساس پر مبنی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس سے زنا کا فعل مرتکب ہوگیا ہے، اور اب اسے چالیس کوڑوں کی سزا دی جارہی ہے۔چاند بی بی چالیس کوڑوں کی ضرب سے بے حال ہوچکی ہے۔تماشائیوں کا جوش و خروش اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ مدھم پڑنے لگی ہے، لیکن اب کوڑے درد سے چیخ رہے ہیں۔کوڑوں کے درد کا یہی احساس بلند اقبال ہمیں محسوس کراتے ہیں کہ جلاد جو زانیہ کو سزا دینے کے کام پر مامور ہے، اچانک سزا دہی کے دوران عورت کو اذیت پہنچاتے پہنچاتے ایک خاص قسم کی

جنسی لذت محسوس کرنے لگا ہے۔ اس کی لذت پرستی کا احساس کوڑوں کو بھی ہو گیا ہے، اور کوڑے احساسِ گناہ کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ مختلف احساسات کو الگ الگ سطحوں پر محسوس کر کے بلند اقبال نے حسیات کی ایک نئی دنیا بسائی ہے، اور ان گناہ گاروں کی طرف بھی انگشت نمائی کی ہے جو ظاہری طور پر نہیں لیکن باطنی طور سے زیادہ بڑے مجرم ہیں۔

بلند اقبال نے مشرق و مغرب کے تضاد کی روشنی میں ایک نفسیاتی مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ مشرق کا فرد جو بظاہر سائنس اور فلسفے کا پرستار دکھائی دیتا ہے، در پردہ گناہ ثواب میں الجھا رہتا ہے، جیسے اس کے اندر ایک لمبی داڑھی والا مولوی چھپا ہو۔ کہانی 'سہاگ رات' کا یہ تضاد کہ شوہر غسل کرنے چلا جاتا ہے، اور بیوی سے دو رکعت نماز پڑھنے، اور روشنی بجھانے کے لیے کہتا ہے کہ غسل کرنا واجب ہے، دو رکعت نماز سنت نبوی ہے، اور روشنی جلانا مکروہ ہے۔ مذہب اور سماج کے ملاپ کا یہ عجیب سا رشتہ ہے۔ یوں تو اعلیٰ سائنسی تعلیم اور مذہب کی اقدار میں تضاد سامنے آتا رہتا ہے، لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ مذہب کا بہت ہی محدود تصور شوہر کے ذہن میں ہے۔ وہ اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے لیکن مذہب کے تعلق سے اس کی سوچ ترقی پسندانہ نہ ہو کر محض ظاہری رسوم و قیود کی پابند نظر آتی ہے۔ خاص طور سے برصغیر میں مذہب چند ظاہری علامتوں میں محصور ہو کر رہ گیا ہے، اور اصل روح کہیں غائب ہو گئی ہے جس کی ترویج و اشاعت کے لیے مذہب کا نزول ہوا تھا۔ کہانی کے موضوع کے علاوہ بلند اقبال کی پیش کش نے بھی موضوع میں گہرائی اور معنویت پیدا کی ہے۔ ایک اقتباس ہے:

> کچھ ہی دیر میں باتھ روم سے آنے والی پانی کے گرنے کی آوازیں اور اس کی آنکھوں سے بہتا ہوا کاجل اسے مذاہب کے روحانی اور سماجی ملاپ سے پیدا ہونے والی سہاگ رات کا مطلب سمجھانے لگے۔ (57)

پانی کے گرنے کی آواز میں دراصل مذہب کی روحانیت اور پاکیزگی کی شان پوشیدہ ہے۔ پانی کے گرنے میں ایک قسم کا ہیجان اور زور ہوتا ہے، آنکھوں سے بہتے کاجل کا منظر ارمانوں کے خاک میں ملنے، خاموشی سے رونے، آنسوؤں کے بہنے اور درد کا پہلو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ سب عناصر مل کر سماجی ملاپ کی علامت بن

جاتی ہیں۔نئی نویلی دلھن کے لیے سہاگ رات مذہب وسماج کے انھیں متضاد رویوں سے عبارت نظر آتی ہے۔ عورت کا یہی کرب اس افسانے کو خاص بناتا ہے کہ مذہب کی ظاہر بین نگاہیں قلبی اور حقیقی جذبات کو آخر کیوں نہیں دیکھ پاتیں، جب کہ مذہبی احکام جسم سے زیادہ روح کو پاکیزہ بناتے ہیں۔

جنسی مسائل

ہم جنسی اب اردو افسانے کے لیے نیا موضوع نہیں رہ گیا ہے۔عصمت چغتائی کے 'لحاف' میں بھی ہم جنسی ہی موضوع تھا، نیز اس میں گے اور لسبین ازم دونوں کو برتا گیا تھا۔نواب صاحب اور بیگم صاحبہ اپنی اپنی الگ الگ دنیاؤں میں مست تھے۔بلند اقبال کی کہانی ہے ''یہ کیسی بے وفائی ہے!'' یہاں موضوع گے (مردوں کی ہم جنسی) ہے اور اس کا ایک سرا بیوی کے تئیں بے وفا ہونے کے جذبے سے جڑا ہوا ہے۔

عفت شادی شدہ ہے۔اس کی زندگی میں اس کے علاوہ کوئی غم نہیں کہ شادی کے دو برس بعد بھی لاولد ہے۔اس کا شوہر منان اسے دل وجان سے پیار کرتا ہے، اور اس کی ہر خواہش کی فوری تکمیل کو اپنا فرض عین سمجھتا ہے۔لیکن وہ ایک جنسی اور نفسیاتی بیماری کا بھی شکار ہے۔اس کا اپنے بچپن کے دوست شرافت کے ساتھ جنسی رشتہ قائم ہے۔ایک دن اچانک اس کی بیوی ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی ہے، اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتا ہے کہ ''یہ کیسی بے وفائی ہے۔''

یہ کہانی اگر چہ ایک فرسودہ موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن اس رشتے کا میاں بیوی کے رشتوں پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے، نیز عورت کس قسم کے ذہنی آزار میں مبتلا ہوتی ہے، اس کیفیت کو ابھارا گیا ہے۔یہ موضوع عورت کے المیے کے طور پر سامنے آیا ہے۔

تہذیبی تصادم اور کش مکش

تہذیبی تصادم اور کش مکش کو بیان کرتی بلند اقبال کی ایک کہانی ہے ''بے زمینی نسل کشی ہے؟''۔اس کہانی کا

مرکزی کردار ایسی ماں ہے جس نے اپنا ٹھکانا ترقی یافتہ دنیا میں بنایا تھا۔ اس کے بچے بھی اسی زمین میں پل کر بڑے ہوئے۔ ماں مشرقی زمین کی پروردہ تھی، چنانچہ یہیں کی کہانیاں اور تاریخ سن کر اس کے بچے بڑے ہوئے۔ مغرب کی تاریخ کا چوں کہ ماں کو بھی علم نہ تھا اس لیے بچوں کی پرورش اور ذہنی تربیت میں نئے ملک کی تاریخ وتہذیب کے کردار شامل نہیں ہو سکے۔ جس کی وجہ سے ان کی شخصیتوں کی نشوونما بھرپور انداز میں نہیں ہو سکی، وہ بچے جذباتی طور سے وہاں کی تہذیب میں گھل مل نہیں سکے۔ برسوں بعد جب ماں واپس اپنے ملک پاکستان میں آتی ہے تو یہاں کی فضاؤں میں بھی اس کے لیے اجنبیت کا رنگ گھل چکا تھا۔ اب وہ بے زمینی کے آشوب سے دوچار تھی۔

ماں نئے معاشرے میں رچ بس نہ سکی، اور اس کی اولاد بھی وہاں برگ وبار نہ لا سکی۔ تب وہ بے چین ہو کر سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ جس ملک میں اس نے ہجرت کی اس کی تاریخ وتہذیب کے بارے میں معلومات نہ ہونے اور محض اپنے ملک کی تاریخ وتہذیب سے آشنائی بچوں کو ادھورا انسان بناتی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ کیا بے زمینی نسل کشی ہے؟

علامتی انداز میں اس کہانی میں افسانہ نگار یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ انسان جس سرزمین کو اپنا وطن بنائے وہاں کی تاریخ وتہذیب کے نقوش سے نہ صرف خود بھی آگہی حاصل کرے بلکہ اپنی اولاد کو بھی واقف کرائے، یہ ان کی شخصیت کی ترقی اور نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ اگر انسان نئے ملک کی تاریخ وتہذیب سے واقفیت رکھتے ہوئے وہاں کی مٹی میں رچ بس جاتے ہیں تو نیا ملک اپنی تمام خوشبوؤں اور رعنائیوں کے ساتھ مہاجروں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ جغرافیائی حدیں کوئی معنی نہیں رکھتیں، اور نئی زمین ہماری نسلوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر قوسِ قزح کے رنگ بھر دیتی ہے۔

متفرق موضوعات ومسائل

بلند اقبال کی کہانیوں کی درجہ بندی میں اس عنوان کے تحت بہت ساری کہانیاں شامل ہو سکتی ہیں۔ چوں کہ ان کے موضوعات شاہراہِ عام سے ہٹ کر ہوتے ہیں، اور خارج سے زیادہ داخل پر اثر انداز ہوتے ہیں، نیز ان کے موضوعات کا کینوس بھی بہت وسیع ہے، اس لیے ان کی کہانیوں میں کچھ نئے نئے قسم کے موضوعات شامل ہوتے

رہے ہیں۔کسی کہانی میں خدا سے سوال کررہے ہیں،اور خدا کو اس کی تخلیق پر آئینہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں،کہیں دہشت گردی اور امن عالم کے موضوع کو کہانی کے مرکز میں رکھا گیا ہے۔ان کی ایک کہانی ہے ''خدا کا بت'' جس میں داخلی تصادم اور علامت کی مدد سے طنزیہ انداز میں کہانی بیان کی گئی ہے۔

بلند اقبال عام طور سے تلمیحی واقعات و شخصیات کی مدد سے اپنی کہانیوں کا پس منظر تیار کرتے ہیں،لیکن اس وقت بھی ان کا تخیل نئے زاویوں سے زندگی کے اسرار و رموز سے نئے انداز میں پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔مذہبی تاریخ بتاتی ہے کہ ابراہیم کو بت شکنی کی پاداش میں آگ کے شعلوں کی نذر کیا گیا تھا،لیکن بلند اقبال کی کہانی میں آزر خود بت تراش ہے، جو زندہ جلایا جاتا ہے۔تاریخی کردار ہونے کے باوجود واقعے کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔بلند اقبال کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ کردار تو تاریخی اور تلمیحی منتخب کرتے ہیں،لیکن انھیں نئی معنویت اور نئے مفہوم کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔یہی اس کہانی میں ہوا ہے۔تاریخی روایات کی روشنی میں آزر معبود تراش تھا، وہ خداؤں کا بت بناتا تھا،لیکن کائنات کا نیا آزر زندگی کے بت بناتا ہے،اس زندگی کے جو بدہیئت ہوگئی ہے۔نتیجتاً اس کے شاہ کاروں سے زندگی کی تلخ حقیقتیں روشن ہوتی ہیں۔

آزر جب بھی کوئی بت بناتا تو وہ کسی اور شکل میں بن کر تیار ہوتا۔تخیل کی نرمی حقیقت کی سنگلاخی کا روپ اختیار کرلیتی۔چنانچہ ماں کا بت خوف زدہ بچے کی شکل میں اور باپ کا بت دست سوال دراز کیے اشرف المخلوقات کا بت بن گیا۔انسان بنانے بیٹھا تو جنگلی بھیڑیے کا بت تیار ہوگیا۔آخر اس نے خدا کا بت بنانے کا سوچا۔خدا ان دیکھا ہے لیکن تخیل کی مدد سے آزر نے خدا کا بت بنا ڈالا۔خدا کا یہ نیا بت بن کر تیار ہوا تو ایک ایسا کمزور بچہ سامنے تھا جو انتہائی لاغر اور ننگا تھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں خالی پیالا تھا۔

''خدا کا بت'' کا مرکزی کردار ابراہیم کا آزر نہیں جو خداؤں کا بت تراش تھا، بلکہ یہ موجودہ دور کا آزر ہے جو تہذیب اور سماج کے نئے نئے بت تراشتا رہتا ہے۔جس نے کبھی مذہب کا استحصال کیا،کبھی خدا کو ڈھونڈنے کا دعویٰ کیا اور کبھی انسان کو اس مقام پر لاکر کھڑا کردیا جہاں ہر کوئی دوسرے کا استحصالی بن گیا۔اس نے عدم مساوات اور ذخیرہ اندوزی کی دیواریں کھڑی کردیں،اور یہی وہ آزر ہے جس نے معصوم بچوں اور نئی نسل کے ہاتھوں میں

کشکول تھمادیے، یا انھیں دہشت گردی کے راستے کا مسافر بنادیا۔افسانہ انسان کے خلاف انسان کے شدید احتجاج کا علامیہ ہے۔

یہ کہانی قدم قدم پر سوالات قائم کرتی ہے۔کائنات کے بارے میں، خدا کے بارے میں، اس کی تخلیق کے بارے میں۔کہانی کو آگے بڑھانے میں جن علامتوں سے کام لیا گیا ہے وہ خود طنز کا لباس پہنے جلوہ گر ہوئی ہیں، اور حیات کی بے اعتباری اور کائنات کی بے یقینی کی غمازی کرتی ہیں۔ماں جو محبت اور ہمدردی کا استعارہ ہے، وہ خوف زدہ بچے کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو دنیا میں آنے کے تصور سے خائف ہے۔اس سے دنیا کی بدہیئتی اور اس کے فرسودہ نظام پر طنز ہے۔باپ سہارے، سایے اور شفقت کی علامت ہے، لیکن اب وہ خود محتاج و مجبور ہے۔انسان جنگلی بھیڑیے کی طرح خوں خوار بن گیا ہے، اور خدا ایسا بچہ ہے جو لاغر و کمزور ہے۔شاید یہاں بچے کی شکل میں فطرت کی مجبوری کا استعارہ ہے۔بچہ ایک نئے پیکر میں یوں بھی سامنے آتا ہے کہ فطرت اپنی تمام تر مجبوری کے باوجود معصوم بچوں اور غریبوں میں بستی ہے۔اس کا یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ فطرت جب بچوں میں بسی ہے تو اشرف المخلوقات کو بھی کمزور بچوں کے تئیں انسانی رویوں میں ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے۔غرض یہ کہانی طنز کے رنگ میں کائنات کے تعلق سے سوالات قائم کرتی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے افسانہ ''شکوہ'' بھی نئے زاویے سے کہانی کو بیان کرتا ہے۔اس میں ایک بوڑھا آرٹسٹ کائنات کے خالق سے تخلیق کائنات کا شکوہ گزار ہے۔بوڑھا آرٹسٹ آسانی سے ایک تخلیق کو مکمل کر دیتا ہے۔آڑی ترچھی لکیروں سے اس کی تخلیق میں جان پڑ گئی۔تخلیق روشن ہوگئی، اس کا ایک ایک پہلو جان دار ہوگیا۔برش کی مدد سے رنگ آمیزی نے تصویر کو یگانۂ روزگار بنادیا۔یہ فن کا کمال ہے لیکن آرٹسٹ کے لیے یہ تصور تکلیف دہ ہے کہ اس کی تخلیق سر بازار نیلام ہوکر فروخت ہو۔یہی تصور اسے خدا سے شکوہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ میری تخلیق تو ایک بار بکی ہے، اور میں اس کے کرب سے پریشان ہوں۔خدایا! تیری تخلیق بھی تو کہیں آسانی سے بنائی گئی کوئی تصویر تو نہیں۔کیا تو نے اپنی تخلیق بار بار بازار میں بکنے کے لیے بنائی تھی؟ یہی سوال اس کہانی کا نقطۂ عروج ہے جو درحقیقت ایک فن کار کے دوسرے بڑے فن کار سے شکوے کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کہانی میں یہ طنزیہ پہلو بھی سامنے آیا ہے کہ سب سے بڑے تخلیق کار کو اپنی تخلیق کے کرب کا شاید احساس نہیں ہے، اسی لیے اس کی تخلیق کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے، بلکہ ہر بار اس کی تخلیق استحصال کے کرب سے دوچار ہوتی ہے۔ آرٹسٹ خدا سے سوال کرتا ہے کہ آخر تو نے یہ سب کیا ہی کیوں؟ جب کہ تو جانتا تھا کہ تیری تخلیق کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ سب سے بڑے تخلیق کار! تو نے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر تو فائز کر دیا لیکن وہی اشرف مخلوق جنسِ بازار بھی بننے پر مجبور کر دی گئی۔ تخلیق کار پر طنز ہے۔

بلند اقبال کی ایک کہانی ہے ''انتظار'' جس میں ایک عورت کو موت کا منتظر دکھایا گیا ہے۔ موت کا انتظار کس قدر شدید اور کرب ناک ہوسکتا ہے۔ اس احساس کو بلند اقبال نے محسوس کیا ہے۔ میرین کو دماغ کا کینسر ہے جو لاعلاج بن چکا ہے۔ اب اسے صرف موت کا انتظار ہے۔ یہ کہانی اسی لمحے اور کیفیت کی ہے کہ بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے جب انسان کے سامنے موت کا انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں بچتا تو انتظار کے یہ لمحات کتنے شدید اور کرب ناک ہوسکتے ہیں، یہ کہانی اس کا اظہار ہے۔ بیماری جب لاعلاج ہو جائے یا بڑھاپے کے آگے موت کے سوا اور کوئی منزل نہ ہو تو دونوں ہی صورتوں میں انتظار کے لمحے کتنے صبر آزما اور ہمت شکن ہو سکتے ہیں، کہانی کا کردار میرین اسے محسوس کر رہی ہے۔ یہ کہانی داخلی طور پر شدید احساسات کی کہانی ہے۔

مذہب کے نام پر دہشت گردی اور انتہا پسندی کا کھیل پوری دنیا میں جاری ہے۔ اس میں کسی خطۂ ارض کی تخصیص نہیں۔ دنیا کا ہر ملک اس انتہا پسندی کا کسی نہ کسی صورت میں شکار ہے۔ برصغیر بھی اس سے اچھوتا نہیں۔ خاص طور سے پاکستانی معاشرہ اس طرح کے واقعات کی زد پر زیادہ آیا ہے۔ اس کے لیے پاکستان کے اندرونی مسائل نیز سیاسی تناسب بھی ایک حد تک ذمہ دار ہے۔ بلند اقبال نے اس موضوع کو اپنی کہانی ''لال چونا'' میں اٹھایا ہے۔

بلند اقبال کے افسانے خارجی دنیا سے زیادہ داخلی دنیا میں سفر کرنے والے کرداروں سے تیار ہوتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ظاہری طور سے حرکت و عمل کی رفتار واضح نہیں ہوتی، مگر ہاں ان کرداروں کا سفر داخلی دنیا میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ گویا ان کے اندر حرکت سے زیادہ غور و فکر کا ہیجان برپا رہتا ہے۔ ہمیشہ ایک داخلی جنگ اور کش مکش چلتی رہتی ہے۔ 'لال چونا' کی کہانی بھی انھیں جذبات کے اردگرد بنی گئی ہے۔

کہانی ایک مسجد کے پس منظر میں آگے بڑھتی ہے۔ مسجد جو انسانیت کی فلاح کا مرکز ہے، جہاں سے امن عالم، مساوات اور اخوت کا پیغام ساری دنیا میں پہنچتا ہے، اور جہاں تزکیۂ نفس کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی اور عالمی سیاست کی کارفرمائی کی وجہ سے مسجدیں دہشت اور انتہا پسندی کی علامت بنتی جارہی ہے۔ مسجدوں میں انتہا پسندانہ حملے زندگی کا معمول بن چکے ہیں، جس میں معصوم جانوں کا ناقابل تلافی نقصان بھی ہوتا ہے۔ بچے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں، وہ بچے جو کسی بھی ملک اور معاشرے کا مستقبل ہیں۔ درحقیقت اس کہانی میں مسجد کے اسی تبدیل ہوتے کردار کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

اس کہانی کا کردار 'گجی' ایسا باپ ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے کو آبائی پیشے سے ہٹا کر تعلیم حاصل کرنے بھیجتا ہے۔ گجی چونا گچ کا کام کرتا ہے، یعنی گھروں، عمارتوں اور مسجدوں کی پتائی اس کا پیشہ ہے۔ دینی اور دنیاوی تعلیم سے اس کا بیٹا آراستہ ہو رہا تھا کہ اچانک مسجد میں دہشت گردانہ حملے کی زد میں آکر جاں بحق تسلیم ہوا۔ اس حادثے کا نفسیاتی اثر اس کے مزدور باپ پر کس انداز سے مرتب ہوتا ہے، اسی کے اظہار کے ساتھ افسانہ مکمل تو ہو جاتا ہے لیکن مذہب و مسجد اور اس کے بدلتے کردار کے تعلق سے چند سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ یہی سوالات اس کہانی کا بنیادی تاثر ہے۔ معصوم بچے کا باپ خاموش نگاہوں سے خدا سے سوال واحتجاج کرتا ہے:

> اس نے جھک کر اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹولا اور پھر بے اختیار اس کے منہ کو چومنے لگا۔ گجی نے اپنے اکلوتے بچے کی لاش کو سینے سے لگایا اور دھاڑیں مارتا ہوا مسجد کے صحن میں آ گیا اور پھر چیخ چیخ کر آسمان کی طرف دیکھ کر رونے لگا۔ جب اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بچے کی لاش کو فرش پہ ڈال کر روتا پیٹتا بھاگتا ہوا چونے کے ڈرم کے پاس آیا۔ اپنے دونوں خون سے لتھڑے ہاتھ چونے کے ڈرم میں گھمانے لگا پھر کچی اٹھائی اور روتے ہوئے صحن کی باقی دیواروں کو لال رنگنے لگا۔ (58)

ان کی ایک کہانی ہے ''اندھا فرشتہ'' اس کہانی میں بلند اقبال نے انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے۔ فرشتہ

اطاعت وفرماں برداری کا پیکر ہے۔اس کی فطرت میں حکم عدولی اور نافرمانی کے عناصر شامل ہی نہیں ہیں۔قاسم اور خانم بیگم ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے والے لاولد میاں بیوی تھے۔ بیوی کا انتقال ہو گیا جس کے غم میں شوہر اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ایک رات نابینا بوڑھے کے خواب میں خانم بیگم آ ہی گئیں:

’’دیکھو نا! مجھے دیکھنے کے لیے تو تمھیں بینائی نہیں چاہیے......اور سنو جی

تمھیں پتا ہے نا؟

وہاں ساری حوریں بانجھ ہیں......میری طرح

اور سارے فرشتے خدا کی محبت میں اندھے ہیں......تمھاری طرح‘‘(59)

یوں تو کہانی سیدھے سادے انداز میں محبت کے لافانی جذبے کو بیان کرتی ہے کہ محبت زندگی کی محتاج نہیں بلکہ وہ یاد بن کر زندگی سے چمٹ جاتی ہے،لیکن کہانی میں انسان کی عظمت،اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا تاثر بھی ہے۔ جنت میں حوریں بانجھ اور فرشتے خدا کی محبت میں اندھے ہیں۔اس کا ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی ناقص صورت میں یعنی جب وہ بانجھ ہو، یا جب وہ اندھا ہو،حوروں اور فرشتوں جیسا ہو جاتا ہے۔مکمل بن جائے تو انسان،اور ناقص صورت میں حور وفرشتہ بنتا ہے۔انسان حور و ملائک سے ان معنوں میں بھی افضل ہے کہ اس کے اندر افزائش نسل کی قوت بھی رکھی گئی ہے،ان معنوں میں وہ تخلیق کی نعمت کا بھی حامل ہے۔مزید ایک نکتہ یہ نکلتا ہے کہ آسمان اور جنت جس کی آس لیے دنیا میں لوگ زندہ رہتے ہیں، وہ بھی نقص سے خالی نہیں۔ بلند اقبال کی یہ کہانی غور و فکر اور پیش کش کے اعتبار سے رجائی لہجے کی حامل ہے۔

امن عالم اور مذہب کے کردار پر یوں تو بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔رنگ اور نام بدل بدل کر دنیا میں کس طرح سے مذہب کا استعمال واستحصال ہوتا آیا ہے،اور اس میں مذہب کے پیروکاروں کا کردار کس حد تک ظالمانہ ہوتا ہے۔انسان کس طرح انسان کے خون کا پیاسا اور اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے، بلند اقبال نے ’’بدلتے چہرے‘‘ میں اسی سے پردہ اٹھایا ہے۔چہرے بدلتے رہتے ہیں،انسان قتل ہوتا رہتا ہے۔دنیا کی پوری تاریخ اسی طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بلند اقبال شاید ایک غیر مذہبی اور سیکولر سماج کی تشکیل کا خواب دیکھتے ہیں جس میں

مذہب کی تبلیغ، مذہبی نسلی تطہیر اور خدا کی خوشنودی کے نام پر انسانیت کا قتل نہ کیا جائے۔

اس کہانی کا کردار محمد عرفان تاریخ کا استاد ہے، اور تاریخ کی روشنی میں وہ جب عالمی سیاست پر نگاہ ڈالتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں جنگ زرگری مذہب کے نام پر لڑی جارہی ہے، اقتدار کی ہوس میں بھی مذہب کا عنصر شامل ہے۔ چنانچہ دی گریٹ ری وولٹ کی جنگ ہو، جس میں موسیٰ کے پیروکاروں نے نصرانیوں کے خون سے موسیٰ کے خدا کا چہرہ لال کردیا تھا۔ مذہب کے نام پر قتل وغارت گری نے خدا کے نام کو بھی خون کی مانند سرخ کردیا تھا۔ تاریخ کے اسی منظر نامے میں فرانس کے گاؤں بے ژیر میں عیسائی کمانڈر سیمن ڈی ماؤنٹ کا چہرہ ابھرتا ہے جہاں نصرانی مسلمانوں پر ظلم وستم کا پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ منظر نامہ پھر تبدیل ہوتا ہے، اب مسجدوں میں اذان کے بجائے دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں، اور بے گناہ نمازی قتل کا نشانہ بنائے جارہے ہیں۔ وضوخانے کا پانی سرخ ہوگیا ہے۔

اس بار منظر برما کا ہے، جہاں مہاتما بدھ کے پیروکاروں نے مسلمانوں کی خانماں بربادی اور مصائب کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ گویا مذہب کے نام پر نفرت کا کھیل ہمیشہ سے جاری رہا ہے، اور تہذیب وترقی کے تمام تر دعووں کے باوجود خوں ریزی کا سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں مذہب کے نام پر خوں ریزی کرنے والے قاتلوں کی داستان ایک ہے، طریقۂ کار ایک ہے، ان کی شکلیں ایک ہیں، فطرت ایک ہے اور مقصد بھی ایک ہے۔ مذاہب کے نام اور چہرے البتہ الگ الگ ہیں۔ یہ سبھی یا تو سفید پوش قاتل ہیں یا نسلی طور سے سفید فام ہیں جن کے دل میں نفرت کی سیاہی اور دانتوں پر تازہ خون کے نشانات ہیں۔

اسی طرح ان کی کہانی ''الیوژن'' بھی عصر حاضر کے ایک بہت ہی نازک مسئلے پر لکھی گئی ہے، دہشت گردی؛ جس نے بہت سارے علاقوں میں اپنے منحوس قدم جما رکھے ہیں اور انسانیت بار بار اس کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ کہانی میں مذہبی دہشت گردی کا اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا سلسلہ تخلیق آدم وحوا اور ان کے دنیا میں بھیجے جانے کے واقعے کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے آج کی دنیا میں دہشت گردی کے مسئلے کو ابھارا گیا ہے کہ کس طرح آدم کو جنت کی بشارت سنا کر اس کی مدد سے اہل دنیا کی زندگی کو جہنم زار بنایا جاتا ہے۔ اس کہانی میں آدم (کوئی کردار نہیں ہے، بلکہ صرف علامت ہے) جنت کا خواب دیکھ رہا ہے، جہاں حوریں اس کی منتظر ہیں، فرشتوں کے پروں کی

سرسراہٹ ہورہی ہے، ایک رنگین کہکشاں آسمان پر جگمگ جگمگ کررہی ہے کہ اچانک زوردار دھما کا ہوتا ہے اور خلق خدا خون میں لت پت ہوگئی ہے۔ آہ وفغاں اور بد دعاؤں کا سلسلہ جاری ہے۔

شیطان آج بھی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے فریب کاری کی مسلسل تدبیریں کررہا ہے۔ شیطان پہلے نادیدہ تھا، لیکن آج اس نے تجسیم کا روپ اختیار کرلیا ہے۔ شیطان نے دانۂ گندم کا لالچ دے کر آدم کو ورغلایا تھا، اور نتیجتاً دانۂ گندم کی پاداش میں آدم کو جنت سے نکلوانے میں کامیاب ہوا تھا، اب وہی شیطان دنیا میں آدم زاد کو حوروں کا لالچ دکھا کر جنت کے خواب دکھاتا ہے، اور اسے خودکش حملوں کے لیے اکساتا ہے۔ آدم زاد شیطان کی عیاری ومکاری کے دام میں گرفتار ہوکر آخر یہ غیر انسانی عمل انجام دیتا ہے۔ یہ اس کہانی کا اہم نکتہ ہے کہ شیطان نے انسان کو پہلے جنت سے نکلوایا اور اب اولادِ آدم کو اسی فردوسِ گم شدہ کا خواب دکھا کر اس سے اپنا کام نکالا چاہتا ہے۔

بلند اقبال کی کہانیوں میں کئی رنگ موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کا جائزہ کسی ایک زاویے سے کرپانا مشکل امر ہے۔ ان کی کہانیوں کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے، کہیں سائنسی اور انسانی ترقی کے مسائل ہیں، تو کہیں صدیوں کی تاریخ میں لپٹی ہوئی استحصال کی کہانیاں، کہیں ترقی اور روشن خیالی کے باوجود روایتی طرزِ زندگی کی جکڑبندیاں ہیں تو کہیں روایت اور تاریخ سے بغاوت کا جذبہ بھی؛ 'چاند پر موت' ایک ایسی کہانی ہے جس میں علامتی انداز میں فطرت کے المیے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، نیز انسانوں میں ترقی کی حرص اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ دھرتی ماں کو بانجھ کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ جس دھرتی ماں کا دودھ پی کر جوان ہوا ہے، اسی دھرتی ماں کی کوکھ کو بانجھ کردینے پر تلا ہوا ہے۔ یہ المیہ دراصل انسانوں کے علاوہ فطرت اور قدرتی مظاہر کا بھی ہے کہ انسانی ترقی کا سیلاب اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے کہ فطرت بھی اس کے نشانے پر آ گئی ہے۔

زمین انسان کی ماں ہے، وہی اس کی پرورش و پرداخت کرتی ہے، لیکن انسان ترقی کی دوڑ میں اندھا ہوکر دھرتی کے سینے کو ہی چاک کررہا ہے۔ یہ اشارہ ہے معدنیات اور دیگر قدرتی وسائل کے استحصال کا، کہ کس طرح انسان اپنی سہولت، آسائش اور اقتدار کی خاطر زمین کے خزانے پر شب خون مار رہا ہے۔ صنعتی ترقی نے زمین کی زرخیزی کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ ہتھیاروں اور جنگی اقدامات نے زمین میں زہر گھول دیا ہے۔ زمین بنجر ہورہی

ہے،اوراس کی آستین کے سانپ اپنا زہراس کے سینے میں اتار رہے ہیں۔لاکھوں انسان اس طرح موت کا لقمہ بن گئے ہیں کہ زمین بانجھ ہونے کی خواہش کرنے لگی ہے۔

انسان کی ترقی کا سفر زمین پر ہی مکمل نہیں ہوجاتا، بلکہ وہ زمین کو مسخر کرنے کے بعد اب چاند پر اپنی کمندیں ڈال رہا ہے۔چاند بھی اس تصور سے لہولہان ہورہا ہے کہ انسان اب اس کے سینے میں بھی آگ اور دھویں کا طوفان اٹھانے والا ہے۔مشین،فیکٹری،فضائی آلودگی اور ہتھیاروں کے کارخانوں کے لیے انسان نے نیا ٹھکانا تلاش کرلیا ہے۔

بلند اقبال کی ایک اور کہانی ہے''بو''اس کہانی کی مدد سے انھوں نے دنیا میں انسانی درندگی کے پردے کو فاش کیا ہے۔پوری دنیا میں جانوروں کی کھالوں کا جو گھناونا کاروبار ہے، نیز فیشن اور ترقی کے نام پر انسان کی بے حسی جس قدر اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے،اس احساس کو یہ کہانی سمیٹتی ہے۔

دین محمد پچیس برسوں سے کھالوں کا سوداگر تھا۔شہر اور گاؤں کے مختلف مذبحوں سے کھالیں اکٹھا کرکے رنگائی کے لیے شیر زمان کی دکان پر دے آتا۔ایک دن ایک چھوٹی کھال کی ناگوار بو نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔کھالوں کی بو ختم نہ ہونے کی شکایت لے کر وہ شیر زمان کی دکان پر پہنچا۔دروازہ بند تھا اس نے غصے میں زور سے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ شیر زمان گھٹنوں میں سر دیے بلک بلک کر رو رہا ہے۔جب دین محمد نے اسے طعنہ دینا شروع کیا تو شیر زمان کہتا ہے:

> پگلے! جب بو بہت تیز ہوتو وہ آنکھ کا آنسو بن جاتی ہے۔تو نے تو صرف پٹی کی ایک کھال سونگھی تھی، میں نے تو اس کی ساری ہی کھالیں رنگی تھیں۔جس شہر میں لوگ بھیڑوں کے ریشم جیسے بچوں کی کھالوں کی ٹوپیاں اور جیکٹس فیشن کے طور پر پہنتے ہوں، وہاں آنکھوں میں آنسو اور ناکوں میں مرے ہوئے بچوں کی بو ہی بستی ہے۔ (60)

یہ کہانی کا نقطۂ عروج ہے۔آخری جملے میں کھال کے کاروباریوں کی بے حسی اور انسانی درندگی کا سارا المیہ بیان میں آگیا ہے۔ بلاشبہ اس کہانی کا موضوع اچھوتا ہے۔زندہ گوشت اور گرم گرم کھالوں کا کاروبار تو عہد قدیم

سے پھل پھول رہا ہے، لیکن عہد جدید میں جب انسان نے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر لیے ہیں، تہذیب وتمدن کے بل بوتے پر اس نے ستاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں، چانداس کی گرفت میں آچکا ہے، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی مروت کے احساس سے انسان دور ہوتا چلا گیا ہے۔ مشینوں کی حکومت دل کے موت بن رہی ہے۔ انسانیت کے زوال کا اشاریہ روز بروز بلند سے بلند تر ہونے لگا ہے، اور اشرف المخلوقات رذالت وشقاوت اور بے رحمی کے غار میں دھنستا چلا گیا ہے۔ ذاتی مفادات، کاروباری غرض مندی اور منافع خوری کی فطرت نے انسان و حیوان کے فرق کو مٹا دیا ہے۔

ان کے بعض افسانے تو داخلی زندگی کی پیچیدگیوں اور کرب کو ظاہر کرتے ہیں، جب کہ بعض افسانوں میں انسان تو کیا فرشتوں کے احساس وجذبات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی نوعیت کا ان کا ایک افسانہ ہے: ''فرشتے کے آنسو'' جس میں انسان کی مجبوری کے ساتھ ساتھ فرشتوں کی مجبوری ومقہوری کے درد کو نمایاں کیا گیا ہے۔

یہ کہانی انسانوں کی بیماری، نیز تقدیر کے ہاتھوں مجبوری کی داستان ہے۔ ایک بیمار لڑکی بے بس نگاہوں سے مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی مکھی کو آہستہ آہستہ مرتے ہوئے دیکھ رہی ہے، اور بستر مرگ پر اپنی موت کا انتظار کر رہی ہے۔ اکیس سال تک لڑکی کی نگہداشت اور بیمارداری کرتے کرتے ایک دن اچانک خاموشی سے اس کی ماں اس دنیا سے چل بسی۔ لڑکی اب ماں اور موت دونوں کا انتظار کر رہی ہے۔ اس افسانے میں انسان کی لاچاری اور قدرت کے ہاتھوں اس کی بے بسی کے المیے کو ابھارا گیا ہے۔ فرشتہ بھی یہ دردناک منظر دیکھتا ہے، اور بارگاہِ خداوندی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ تقدیر کا لکھنے والا خاموش ہے۔ اس نے انسان کو زندگی تو بخش دی لیکن اس قدر مصائب میں جکڑی ہوئی ہے کہ فرشتہ بھی اس کی تاب نہ لا سکے۔ فرشتہ جو روزِ اول سے اطاعت وفرماں برداری کا پیکر رہا ہے، اسے انسان کی مجبوری نے اس قدر متاثر کر دیا کہ وہ سرنوشت لکھنے کے بجائے رونے لگا۔

بلند اقبال نے ''شاہ دولہ کے چوہے'' میں ایک سماجی مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ سوال قائم کرتے ہیں کہ کیسے ممکن ہے کہ اکیسویں صدی میں معصوم بچوں کو لوہے کی ایسی ٹوپیاں پہنا دی جائیں جو ان کے ذہنی نشو ونما کو متاثر کریں۔ معصوم بچوں پر یہ ظلم صرف شاہ دولہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر سماج، مذہب اور معاشرے میں والدین اندھی

عقیدتوں کی ٹوپیاں اپنے بچوں کو پہنا دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بالغ ہو کر بھی وہ بچے ذہنی طور پر نابالغ رہ جاتے ہیں۔اور اس عمل میں ترقی یافتہ و پس ماندہ ممالک کی کوئی قید نہیں۔ یہ کاروبار ہر ملک میں یکساں سطح پر جاری ہے۔

وہ اپنا فلسفہ تراشتا ہے۔ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ......
اشتراکیت اور جدیدیت سے الگ اپنی راہ بناتا ہے اور کسی حد تک یہ کہا
جاسکتا ہے کہ بلند کے پاس اگر کوئی ازم یا راستہ ہے تو وہ انسانی زاویہ ہے۔
وہ اپنی ہر کہانی میں اسی انسانی زاویے کو برتنے کی کوشش کرتا ہے۔[61]

بلند اقبال نے ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' کے نام سے ایک ناول بھی تخلیق کیا ہے، جس کی ضخامت تقریباً پونے دوسو صفحات ہے۔اس ناول پر ہندوستان کے قلم کار نورالحسنین نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔اپنے پیش لفظ میں نورالحسنین ناول کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اسے اردو کا پہلا ناول قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ مشرقی اقدار اور مغرب کی بدلتی ہوئی فکر اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ ناول اپنے وقت سے کم از کم پچاس یا ساٹھ برس آگے کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔''

یہ ناول ایک ایسے حادثے سے شروع ہوتا ہے جہاں سفید لباس میں ملبوس ایک شخص کو پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کا مجرم (بلاسفمی) کہہ کر بیچ چوراہے پر زندہ جلا دیا جاتا ہے۔اس کام کو انجام دینے والا شخص ادریس ہے جس کے کام سے خوش ہو کر مذہبی رہنما اور ٹھیکے دار اسے انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔ یہ سارا واقعہ ادریس کا بیٹا عثمان ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے سے چھپ کر دیکھتا رہتا ہے۔یہ ٹوٹی ہوئی دیوار بوسیدہ اور خستہ حال روایات کی علامت کے طور پر نظر آتی ہے، جس کے پیچھے سے نئی نسل خوف اور دہشت میں مبتلا ہو کر معصوم نظروں سے مستقبل کا سرا تلاش کر رہی ہے۔ادریس کے بچے کی نفسیات پر اس حادثے کا اس قدر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز سے خوف زدہ ہونے لگتا ہے۔اسے اپنے باپ ادریس سے اتنی وحشت ہو جاتی ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی عثمان کو دورے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ دورہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس پر کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔عثمان ابھی معصوم ہے۔اس کے دل و دماغ پر مذہبی تنازعات، مسلکی اختلافات اور رنگ و نسل کے امتیازات کی لکیریں بہت واضح نہیں ہیں، اس لیے یہ

تمام مناظر وواقعات اس کی روح کو خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ یہ ان معنوں میں ملک کے ارباب حل وعقد کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے جہاں مستقبل کے معمار ذہنی مریض بن جائیں۔

ادریس جو پہلے ایک معمولی، بے روزگار، لاابالی اور غیر ذمہ دار شخص تھا، اس واقعے کے بعد اس کی زندگی میں دولت کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ مولوی سلیم اللہ نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ اس نے بہت نیک کام کیا ہے، بلکہ اسے مدرسے کے کام پر بھی لگا دیتے ہیں۔ کہانی سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ مذہب کے ٹھیکے دار مذہب کے نام پر جذباتی اور بے روزگار نوجوانوں کو دامِ فریب میں الجھا کر ان سے ایسے سارے کام کراتے ہیں جن سے سماج میں انتشار اور انارکی کا ماحول بنا رہے۔

اس کے ساتھ ایک اور متوازی کہانی افغانستان کے پروفیسر واحدی کی ہے جو بیس برس پہلے مذہبی تشدد کا شکار ہوا تھا اور نتیجے میں اپنی محبوبہ اور والدین کو کھو چکا تھا۔ پروفیسر واحدی کے ذہن میں گلوبل ورلڈ کا خواب سجا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جہاں انسان رنگ، نسل، مذہب اور زبان کو بھول کر ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ واحدی کی اس کوشش کو ناکام کرنے کے لیے اسے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ اس پر حملہ بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود پروفیسر واحدی ناامید اور مایوس نہیں ہوتا۔

پروفیسر واحدی کے علاوہ ایک اہم کردار واحدی کا ایک روشن خیال دوست ناظر عزیزی ہے۔ عزیزی اور واحدی کے درمیان کا مکالمہ بلند اقبال کے فلسفۂ حیات کو بہت واضح لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ ناظر عزیزی اور پروفیسر واحدی کے درمیان کا مکالمہ ملاحظہ فرمائیے:

> عزیزی نے ہنستے ہوئے کہا: ''اچھا تو تمھارے خیال میں ضرورت ایجاد کی
>
> ماں ہے؟''
>
> ''ہاں، اور اقتصادیات باپ ہے۔ اور جس کی بہت ساری بیویاں ہیں۔
>
> ان میں سے جو سب سے زیادہ خوب صورت ہے، اس کا نام مذہب ہے۔
>
> اس کی دوسری بیوی کا نام قومیت ہے۔ تیسری زبان تو چوتھی رسوم ورواج؛

اب جسے چاہے وہ بازار میں لے آئے۔اس کا کوئی دین ایمان تھوڑا ہی
ہے۔'' یہ کہہ کر ہنستے ہوئے واحدی اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔[ٹوٹی ہوئی
دیوار،ص48]

ناول میں دو کردار اور بھی ہیں جس میں ایک پاکستانی لڑکی ثانیہ جو کینیڈا کی شہری ہے اور اس کے ہندوستانی بوائے فرینڈ دلیپ جو کینیڈا میں میڈیکل سائنس کا طالب علم ہے، کی محبت کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ثانیہ احمدی مسلمان ہے اور دلیپ مذہب کے اعتبار سے سکھ مذہب کا پیروکار ہے۔ثانیہ کے والدین اس رشتے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ثانیہ ایک بہت ہی باشعور کردار کے روپ میں سامنے آتی ہے۔دلیپ ایک ذہین اور باشعور فرد ہے۔ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ پروفیسر واحدی کے گلوبل ورلڈ کی نمائندگی کرنے والے فرد ہیں، جہاں تعلیم نے لوگوں کو اتنا باشعور بنا دیا ہے کہ وہ اپنے اچھے برے کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔اس کے ساتھ ہی ان کی پشت پر اس ملک کا قانون موجود ہے جو ہمہ وقت ان کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔

پاکستانی سماج میں مذہبی اجارہ داری اور تشدد کا پہلو بہت واضح طور سے نظر آتا ہے۔ادریس جیسے جذباتی اور کم خواندہ شخص کو مذہب کے نام پر تشدد کرنے کے لیے اکسایا جاتا ہے، اس کے مجرمانہ عمل کو نیکی اور ثواب کا نام دے کر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر سماج میں انتشار اور بکھراؤ کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہ کام کرنے کرانے والے اس بات سے بالکل بے نیاز رہتے ہیں کہ ان کے اس اقدام کا اثر آئندہ نسلوں پر کس طرح مرتب ہوگا! ادریس کا بیٹا عثمان اس نئی نسل کی نمائندگی کر رہا ہے جو درحقیقت مستقبل کے پاکستان کا معمار بننے والا ہے۔

ناول میں افغانستان بھی ہے جو چالیس پچاس برسوں سے جنگ، تشدد، خانہ جنگی اور مذہبی شدت پسندی کی ضرب برداشت کر رہا ہے۔طالبان ایک عرصے سے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں، نیز بدلتی اور آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے شانہ بشانہ چلنے سے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ناول نگار نے اس نکتے کو فن کاری اور باریکی سے بیان کیا ہے۔ اس دہشت زدہ ماحول میں بھی بعض افراد ایسے ہیں جو امن کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور مستقبل کی روشنی سے مایوس قطعاً نہیں ہیں۔ پروفیسر واحدی کا کردار ایک ایسے فرد کا ہے جو حال سے مایوس نہیں بلکہ مستقبل سے پرامید ہے۔

اس ناول میں بلند اقبال نے تین ممالک کے سماجی پس منظر سے کام لیتے ہوئے مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کے ہاتھوں میں کیمرا ہے اور اسے گھما گھما کر قاری کو سارے مناظر اس طرح دکھاتا جاتا ہے کہ پورا معاشرہ خوبیوں اور خامیوں سمیت دکھائی دینے لگا ہے۔ سماج کی عکاسی میں بلند اقبال نے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ کرداروں کی نفسیات اور داخلی کیفیت کو بیان کرنے میں انھوں نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کہانی ایک ٹریجڈی سے شروع ہوئی تھی اور ایک دوسرے المیے پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول کی ابتدا میں گستاخِ رسول کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ناول کے اختتام پر قادیانی مذہب کے تئیں معاشرے میں موجود نفرت کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔